محمد علی

ذاتی ڈائری

کے چند اوراق

از

مولانا عبدالماجد
دریا بادی

ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اقبالؒ

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند اوراق

از

عبدالماجد دریابادی

ناشر

ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

پہلا ایڈیشن ایک ہزار

فروری ۱۹۴۳ء

مطبوعۂ
اعظم اسٹیم پریس
گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشر
حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد علی

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں (اقبالؒ)

سچ کہا ہے میرؔ نے کہ عشق، اپنا ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے۔ مولانا محمد علی کی زندگی تمام تر عشق ہی کی ہمدم و ہمدرد تھی۔ وہ باطل کے مقابلہ میں یکسر فرزانہ، حق کے میدان میں سربکف دیوانہ تھے۔ ان کی موت بھی انقلاب انگیز جہد اور طوفان خیز جہاد کے ایک یادگار دور کا سرانجام ہے ع

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

حضرت اقبالؒ نے دُعا کی تھی ؎

خواہی اگر حریفِ یم بیکراں کنی — با اضطراب موج سکون گہر بدہ

محمد علی ان صفات کے ممتاز مظہر تھے۔ ان کا ایمان سکون گہر تھا اور اُن کا عمل اضطراب موج۔

اقبالؒ کی نظم "مردِ حُر" میں جب یہ اشعار پڑھتا ہوں

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف — ما بمیداں سر بجیب او سربکف
مردِ حُر از لاالٰہ روشن ضمیر — می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش — اُو ز دستِ مصطفےٰ پیمانہ نوش

تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس مردِ حُر کی تفسیر و تشریح محمد علیؒ کی مثال سے کی جائے۔ صد افسوس کہ ہم دلی تمنا کے خلاف جلد اس مردِ حُر کی زندگی بخش صحبت سے

محروم ہو گئے۔ آیندہ نسلیں ان کے دل کی دھڑکن اور ان کے جوش و ہوش کو ان کی کسی معیاری سیرت ہی میں پا سکتی ہیں۔

خدا کی خدائی میں سب سے بڑی نعمت بڑے آدمی ہیں۔ کسی زبان کی قدر و قیمت کا ایک اہم معیار میرے نزدیک اس کا دفتر سیرت اور سوانح بھی ہے لیکن کسی بڑے آدمی کی سیرت، کسی بلند مرتبہ صاحب نظر و اہل قلم کی طالب ہوتی ہے ع

عشق در صحبت میخانہ بگفتار آید

اردو ادب کی خوش قسمتی ہے محمد علی کے طوفانِ جذبات کا نقشہ "فلسفہ جذبات" کے مصنف نے کھینچا ہے اور محمد علی کی مذہبی اور سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی داستان مترجم قرآن، صاحب تصوف اسلام و فلسفہ اجتماع کی زبان قلم نے بیان کی ہے شخصیت اگر عظیم الشان ہے تو سوانح نگار کی فکر و نظر بھی شایانِ شان۔ نہایت عمیق اور دقیق ذاتی ڈائری کے یہ چند اوراق و مقالات نچوڑ ہیں مصنف کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا۔ یقیناً یہ چند اوراق بلند پرواز، تاریخ ساز محمد علی کی ہمہ گیر حیات پر پورے پورے حاوی نہیں ہو سکتے لیکن یہ اس شہباز کی نادر خصوصیات کا ایک آئینہ ہیں نہایت مجلّی اور مصفیٰ۔ یہ پڑھنے والوں کو ان بندوں کی خلوت و جلوت میں لے جاتے ہیں جو خدا کے لیے دونوں عالم سے خفا ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی اس سے ہمارے پیکر خاکی میں بھی حیات کی لہر دوڑ جاتی ہے

باسول کی لائف آف جانسن اور مسٹر چرچل کی ہمعصر مشاہیر پر اگر انگریزی زبان فخر کرتی ہے تو اردو کے لیے بھی مولانا عبدالماجد کی "محمد علی" مایۂ ناز ہے۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ آخر میں جناب اقبال سلیم صاحب نے اپنے ذوق سلیم کے تقاضہ سے چند بلند پایہ منظوم اور منثور مراثی شامل کر دئے ہیں۔ اس کی اشاعت پر محترم مصنف ہوشمند ناشر ناظرین اور بھی حسب مراتب مبارکباد کے مستحق ہیں والسلام ربنا تقبل منا

نیاز کیش

غلام دستگیر رشید

لکچرر فارسی نظام کالج۔ حیدر آباد دکن

محمد علی

اگست سنہ ۱۹۱۲ء کا زمانہ ہے "مسلم یونیورسٹی" کا غلغلہ ہر طرف برپا ہے ہر زبان پر اس کا تذکرہ، ہر جگہ اسی کا چرچا۔ آغا خان کا دورہ، ہندوستان کے طول و عرض میں ختم ہو چکا اور اب وہ دورہ راجہ صاحب محمود آباد کا ہے۔ وہی اس کشتی کے ناخدا ہیں۔ کانسٹیٹیوشن کمیٹی (مجلس وضع آئین و ضوابط) اپنا کام شروع کر چکی ہے۔ اور ساری قوم کی نگاہیں اب اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ چوٹی کے افراد قوم بھر سے چنے ہوئے اس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اب کمیٹی کا اجلاس لکھنو میں طلب ہوا ہے، اور راجہ صاحب کے زیر صدارت انھیں کے قصر قیصر باغ میں ہو رہا ہے کمیٹی کے سامنے وقت کے بڑے بڑے اہم اور نازک مسئلے چھڑے ہوئے ہیں، اور معلوم یہ ہو رہا ہے کہ قوم کی موت و حیات کا دار و مدار اسی کے فیصلوں پر ہے۔ تقریریں، خوب خوب، ایک سے بڑھکر ایک ہو رہی ہیں۔ قابلیت اور فصاحت دونوں کے دریا بہہ رہے ہیں، بہار اور بنگال، سرحد اور پنجاب، علیگڈھ اور الہ آباد۔ سب کہیں کے مسلمان دماغوں کا عطر کھنچ کر لکھنو آگیا ہے۔ راجہ صاحب اپنے وسیع ڈرائینگ روم کے وسط میں تشریف فرما ہیں۔ سامنے بہت بڑا لمبا میز دھرا، دو رویہ کرسیوں کی لمبی قطار۔ میز کے ایک گوشہ میں ایک جوان رعنا، اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس، منڈھی ہوی داڑھی اور نکیلی موچھوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے، ذہانت اس کی ایک ایک ادا سے نمایاں۔ ممبروں کی نظریں اس کی طرف بار بار اٹھ رہی ہیں۔ اور کان اس کی آواز پر لگے ہوتے۔ وہ بولا تو سب سننے لگے۔ وہ کھڑا ہوا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا، لیکن متوجہ سب ہی ہو گئے

یہ تھا کامریڈ کا شہرۂ آفاق ایڈیٹر محمد علی، جس کی جادو نگاری کا سکہ اس وقت

بھی ہر دل پر بیٹھ چکا تھا۔

میں اُس وقت لکھنؤ میں بی اے کا طالب علم تھا۔ اپنے بعض عزیزوں کے ہمراہ ہمت کر کے راجہ صاحب کے ہاں پہونچا تھا۔ اور تماشائیوں کی صف میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا محمد علی کا نام آٹھ دس سال سے سننے میں آرہا تھا۔ انگریزی تحریریں بکثرت نظر سے گزر چکی تھیں شوق دیدار آج پہلی بار پورا ہو کر رہا۔ ۱۲ء کو ۱۲ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن لوح حافظہ پر یہ نقش اس قدر گہرا ہے کہ ابھی کل کا تازہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ وضع و لباس، سج دھج، چال ڈھال خط و خال، سب محفوظ!

⁂

اُسی شام کو بعد مغرب مسلم کلب کے بالا خانہ پر باہر کے آئے ہوئے لیڈروں کے خیر مقدم میں ایک مختصر سی بزم مرتب ہوتی ہے۔ ۱۲ء کا مسلم کلب کچھ چیز ہی اور تھا۔ امین آباد پارک میں واقع تھا۔ اور پارک خود اُس زمانہ میں ایک نمایش گاہ بنا ہوا تھا۔ نیا نیا تیار ہوا تھا، مقابل کے امین الدولہ پارک کا وجود تک نہ تھا۔ سید میر جان کلب کے سکریٹری تھے۔ مستعدی و قوت عمل کے ایک پیکر مجسم۔ دو منزلہ کی کھلی ہوئی ہوادار چھت برف اور شربت، سوڈا اور لیمونیڈ پان اور سگریٹ کے دور چل رہے ہیں۔ اور لیڈروں کی جھلک دیکھنے کو مشتاقان دید کا ایک خاصہ گروہ موجود۔ اُس وقت تک جمہوریت کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت کے لیڈر، عوام سے الگ تھلگ رہنے والے، امرا و روسا کے طرز کے ہوتے تھے۔ عوام کو قریب سے اُن کے درشن کرنے کے مواقع۔ قسمت ہی سے کبھی ہاتھ آتے۔

صبح کی میٹنگ اگر خواص کی مجلس تھی، تو شام کی یہ تقریب ایک دربار عام۔ اسلامی ہند کے چنے ہوئے لیڈر اور مشاہیر، ایک جگہ مجتمع، آزادی کے ساتھ ہنس بول رہے ہیں لیکن بارات کا دولھا اس وقت بھی کمریڈ کا ایڈیٹر ہے! وضع ظاہری۔ صبح سے بالکل مختلف سر پر ترچھی رامپوری ٹوپی، جسم پر باریک و نفیس انگرکھا، تنگ مہری کا چوڑی دار پاجامہ، دہلی کا جوتہ، ملنے اور بات چیت کرنے کی ہمت کیا ہوتی۔ دل اسی پر مسرور و نازاں، کہ

اتنے قریب بیٹھنے اور گفتگو سننے کا موقع مل گیا۔ کامریڈ کی سحر نگاری سے، مسلمان تو مسلمان ہندو طلبہ تک متاثر تھے، اُن کے درمیان بیٹھ کر، اظہار فخر کے لئے اتنا بھی بہت تھا۔

۱۲ء ختم ہو رہا تھا، کہ پایۂ تخت کے، کلکتہ سے دہلی منتقل ہونیکا اعلان ہوا۔ مسٹر محمد علی کے تعلقات اُسوقت اعلیٰ حکام، اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبروں سے خاص تھے، ستمبر ۱۲ء میں کامریڈ بھی کلکتہ سے منتقل ہوا، اور ۱۲ اکتوبر ۱۲ء کو دہلی سے اس کا پہلا پرچہ نکلا، اسی زمانہ میں "نقیب ہمدرد" کی بنیاد پڑی، اور ۱۳ء سے خود ہمدرد نکلنا شروع ہوا۔ ہمدرد کی ادارت کے ساز و سامان جس پیمانے پر ہوئے، وہ اُس زمانہ میں اردو روزناموں کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھا۔ ادیب جلیل میر محفوظ علی صاحب بی اے بدایونی۔ اُس وقت مسٹر محمد علی، مالک و مدیر ہمدرد کے مشیر خاص تھے انھیں کے مشورہ سے ادارات کے لئے۔ پہلے تو مولوی عبد الحق صاحب بی اے (حیدر آباد دکن) سے مراسلت رہی۔ لیکن تقرر بالآخر اس عہدہ پر، اردو زبان کے مشہور ادیب و ناول نویس مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم کا ہوا۔ ستمبر میں شرر صاحب دہلی روانہ ہوئے۔ یہ ضرور نہ تھا کہ جو مشاق ناول نویس ہو، وہ ایک روزنامہ کا بھی ایڈیٹر ہو۔ شرر صاحب چند ہی روز کے بعد واپس آگئے۔ اور مسٹر محمد علی کو ایڈیٹوریل صیغہ کے لئے۔ قاضی عبد الغفار بی اے اور سید جالب مرحوم۔ اور پھر ایک عرصہ کے بعد فاروق صاحب دیوانہ وغیرہم متعدد مددگار مل گئے۔

میرے مضامین اُس وقت کے علمی و ادبی رسائل۔ الناظر، ادیب وغیرہ میں دو ایک سال قبل سے نکلنے شروع ہو چکے تھے۔ جب ہمدرد کا آفتاب طلوع ہونے کو ہوا۔ تو اُس کی خدمت کا حکم مجھے بھی ملا۔ علمی مضامین کی فرمایش ہوئی۔ اور متعدد گرامی نامے اس سلسلہ میں موصول ہوئے۔ لیکن ان میں سے کوئی خط، خود محمد علی صاحب کا نہ تھا۔ البتہ انھیں کے ایماء سے شرر صاحب کی طرف سے ہوتے تھے، اور شرر صاحب کے چلے آنے کے بعد، دو ایک بار قاضی عبد الغفار صاحب کی طرف سے

آئے۔ دستخط کسی ایک آدھ خط پر محمدؒ علی صاحب کے بھی تھے۔ اس دور کے مراسم کی کل اتنی ہی کائنات رہی۔

دسمبر ۱۲ء کی آخری تاریخیں ہیں۔ لکھنو کی قیصر باغ بارہ دری میں کانفرنس کا اہم جلسہ اور اس سے بھی بدرجہا زائد اہم وہنگامہ خیز جلسہ مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کا ہو رہا ہے۔ الہلال مسلم گزٹ۔ اور کمریڈ کے مسلسل پرجوش مقالات نے مسلمانوں کے عام طبقہ میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اور آج پہلی مرتبہ وہ اپنے اختیارات سے کام لینے کو جلسہ میں آئے ہیں۔ ابتک ان کا کام جلسوں میں صرف تقریروں کا سننا اور فصاحت بیان کی داد دینا تھا۔ رزولیوشنوں کی تحریک وتائید تمامتر لیڈروں ہی کے لئے مخصوص تھی۔ آج پہلی مرتبہ عامتہ الناس (پبلک) نے طے کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کو وہ خود طے کرکے رہیں گے۔ یہ استبداد اور حریت کی تجربہ اور جوش کی سب سے پہلی معرکتہ آلارا قابل دید جنگ تھی۔ اہل اقتدار کا اصرار تھا۔ کہ یونیورسٹی جن شرائط پر بھی مل رہی ہو۔ بہرحال لے لینا چاہئے۔ ادھر آزاد خیالوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی اگر ملے، تو قوم کے شرائط پر ملے۔ ورنہ سرے سے یونیورسٹی لینا ہی نامنظور کیا جائے علیگڈھ پارٹی کے دوسرے بزرگوں کو تو زبان کھولنی دشوار تھی، ادھر کچھ کہنے کو کھڑے ہوئے اور اُدھر جلسہ نے طرح طرح کے آوازے کسنے شروع کر دئے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم بڑی سلجھی اور سنجیدہ تقریر کرنیوالے خوش بیان مقرر تھے لیکن ان کی متین مدلل تقریر بھی ناکام رہی۔ ان کے دلائل سے مطمئن ہونا الگ رہا۔ جلسہ نے ان کی یہی بڑی تعظیم کی، کہ ان کی تقریر کو صبر وسکون کے ساتھ سن ہی لیا ہے۔ ایک جوش وتلاطم ہر سو برپا تھا۔ اور وقت کا ہر لمحہ "باغیوں" کے سردار، مولانا ابوالکلامؒ (صاحب الہلال) کی فتحمندیوں کو نمایاں سے نمایاں تر کرتا جا رہا تھا۔ اس منزل پر پہونچکر اجلاس دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو رہا۔

رات فریقین نے خدا جانے کن کن اُمیدوں اور آرزوؤں اندیشوں اور

مایوسیوں کے ساتھ گزاری۔ صبح ہوئی۔ تو آج قیادت کا علم کامریڈ کے ایڈیٹر کے ہاتھ میں تھا۔ محمد علی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو سارا جلسہ ایک پیکر اشتیاق و انتظار تھا۔ محمد علی کی تحریر، کا لوہا سارا ہندوستان مانے ہوئے تھا۔ لیکن تقریر کی ابتک کوئی خاص شہرت تھی ایڈیٹر " کی حیثیت سے سارے ملک پر محمد علی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن لیڈر کی حیثیت سے ابھی محمد علی کا شمار صف اول میں نہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری والے بلقان کے طبی مشن کو ابھی ابھی انھیں نے روانہ کیا تھا۔ اور اس جلسہ میں جب تقریر کو کھڑے ہوئے ہیں۔ تو وہی طبی مشن والی خاکی وردی زیب تن تھی۔ عمر کی طرح صحت بھی ابھی پورے شباب پر تھی۔ اور آواز اتنی بلند کہ بڑی سے بڑی عمارت کے ہر گوشہ میں بہ آسانی پہونچ سکتی محمد علی کی لیڈری کا یہ پہلا امتحان تھا۔ تقریر شروع ہوئی اس میں نہ مولانا ابوالکلام کی طرح الفاظ کا جادو تھا۔ نہ صاحبزادہ صاحب مرحوم کی طرح سنجیدہ استدلال تھا شروع سے آخر تک ذاتی ضمانت کی تحریک تھی۔ محمد علی نے نہ لائل منطق سے کام لیا۔ نہ خطابت کا حربہ چلایا۔ بس اپنے کو صداقت و خلوص کے ساتھ، قوم کے آگے پیش کر دیا خلاصہ تقریر یہ تھا کہ آپ مجھے "سادہ چک" دیجئے مجھ اور میرے فلاں فلاں رفیقوں پر اعتماد کیجئے۔ ہم لوگوں کا وفد جو شرائط مناسب سمجھے گا۔ طے کریگا۔ تقریر جس حد تک موثر و کامیاب رہی۔ اتنے کی توقع شاید خود مقرر کو بھی نہ تھی۔ جنگجو فریقین کی پیشانیوں کے بل مٹے۔ تالیوں کی گونج اور نعرہ ہائے مسرت کے شور میں تجویز منظور ہوئی۔ محمد علی پہلے امتحان میں کامیاب ہوئے آج کے دن سے کامریڈ کے ایڈیٹر کا شمار پبلک لیڈروں کی صف اول میں ہونا شروع ہوا۔

راقم سطور نے ۱۹۱۲ء میں بی اے کیا ام اے کی ناکام تحصیل کے بعد ۱۹۱۳ء کے آخر سے وہ "تلاش معاش" شروع ہوئی۔ زبردست سفارشیں اس وقت بھی بہت ضروری تھیں۔ ریلوے میں ایک معزز عہدہ اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے نام سے نیا نیا اسی زمانہ میں کھلا تھا۔ ابتدائی خیال اس جانب گیا کہ کسی کالج میں پڑھانے کی جگہ

مل جائے۔ جب اُدھر ناکامی ہوئی تو بعض احباب کے مشورے سے اس عہدہ کیلئے خیال ہوا۔ تقرر ریلوے بورڈ کے ممبروں اور گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ میں تھا۔ ان تک رسائی کا کوئی معقول ذریعہ اسوقت ممکن نہ تھا۔ خدا بخشے۔ شیخ ولایت علی مرحوم بی اے وکیل بارہ نبکی محمد علی کے خاص الخاص احباب و معتقدین میں سے تھے۔ "بمبوق" کے نام سے کامریڈ میں بہترین ظریفانہ مضمون انھیں کے قلم سے ہوتے تھے کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھا کرتے تھے۔ ان بیچارہ نے کہا کہ میں محمد علی کے نام تعارف نامہ لکھے دیتا ہوں اسے لئے دہلی چلے جاؤ وہ وہاں تمام حکام اور اعلیٰ افسروں سے ملا دیں گے ۱۹۱۴ء میں برسات کا موسم تھا۔ جب میں اپنی اس خالص ذاتی غرض کو لیکر دہلی پہونچا۔ اسٹیشن سے سیدھا دفتر ہمدرد کوچہ چیلان کے لئے تانگہ کیا۔ فاروقی صاحب "دیوانہ" اب عرصہ ہوا ہمدرد میں آچکے تھے۔ اور "تجاہل عامیانہ" میں مصروف تھے انھیں ہمراہ لیا۔ اور ڈرتے ڈرتے محمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مگر مجھے اُس زمانہ میں رمضان سے کیا واسطہ تھا۔ ہمدرد و کامریڈ کا دفتر ایک عالیشان عمارت میں تھا۔ اُس کے مقابل ایک اور مکان تھا۔ اس میں محمد علی صاحب خود رہتے تھے۔ حاضری وہیں ہوئی۔ ایک معمولی سا کمرہ، بجز ایک مختصر سیتل پاٹی کے ہر قسم کے فرنیچر سے معریٰ۔ نہ میز نہ کرسی، نہ کوچ نہ صوفے اس جانماز نما سیتل پاٹی پر ٹھیٹھ ہندوستانی قسم کا کرتہ پاجامہ پہنے کامریڈ کا ایڈیٹر بیٹھا ہوا۔ چند لوگوں سے جامع مسجد کے فرش وشامیانے سے متعلق بحث و گفتگو میں مصروف! میں تو اس سادگی اور اس مشرقیت کے منظر کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اور اپنی انگریزیت پر سب کو قیاس کئے ہوئے تھا بہر حال میری پیشی ہوئی، اور اسی لمحہ سے میرے ساتھ تپاک اور محبت کا برتاؤ شروع ہوگیا۔ خط پڑھا۔ زیادہ ملتفت ہوئے۔ کچھ دیر کے بعد اپنے ہمراہ دفتر کے کمرے میں لائے یہاں کی شان دوسری تھی ڈرائینگ روم، کچھ انگریزی اور ترکی وضع کے بیش قیمت فرنیچر

سے آراستہ ہر دیوار تصویروں سے مرصع! ۱۹۱۴ء کا محمد علی۔ ۱۹۱۱ء کا محمد علی نہ تھا۔ بڑھی ہوئی سیاسی آزاد خیالی اور ترکوں کے ساتھ روز افزوں ہمدردی نے حکام اور حکومت کے طبقہ میں اب وہ پہلی سی مقبولیت و مرجعیت باقی نہیں رہنے دی تھی۔ انگریز حکام کی ہوشیاری و باریک بینی کا کیا کہنا۔ دوست دشمن کو ادنیٰ سے ادنیٰ علامتوں سے بھانپ لیتے ہیں۔ ادھر محمد علی کی فراست ایمانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ سمجھ چکے تھے کہ اب خداوندان حکومت پر کوئی اثر باقی نہیں ہے۔ بڑی دیر تک تفصیل کے ساتھ اپنی معذوریاں بیان فرماتے رہے، گویا میرا کام نہ نکال سکنے پر نادم و منفعل تھے۔ کھانے کا وقت آیا، اور باوجود خود روزہ دار ہونے کے مجھ سے کھانے کے لئے دیر تک اصرار جاری رکھا۔ میں شام کی ٹرین سے واپس ہوا۔ آخر وقت تک مسلسل جس جس طرح اخلاق صرف فرماتے رہے اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ لیڈر صاحبان کے اخلاق پبلک میں جیسے کچھ بھی ہوں، نجی زندگی میں ایسی خوش اخلاقی اور غیر محدود لطف و محبت کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔

نومبر ۱۹۱۵ء میں اپنی نظر بندی کے زمانہ میں لینسڈون پہاڑ سے چھندواڑہ کو منتقل ہوئے۔ تو لکھنؤ سے ہو کر گزرے، اور لکھنؤ اسٹیشن پر سرسری ملاقات ہوئی۔ آخر ۱۹۱۵ء میں میری انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" لندن میں شائع ہوئی ۱۹۱۶ء میں اس کے متعلق بہت مفصل و دلچسپ مراسلت، پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں رہی۔ یہ خطوط ان صفحات میں نقل ہو چکے ہیں۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے اپنی محبت و حسن ظن سے مجھے کانفرنس آفس میں طلب فرمایا، اور لٹریری اسسٹنٹ (مشیر علمی) کی خدمت سپرد فرمائی۔ مجھ میں کسی ملازمت کی بھی اہلیت نہ تھی۔ دو مہینے علیگڈھ میں کس مشکل سے کاٹ کر علالت و ناموافقت آب و ہوا کا عذر کر کے مستعفی ہو گیا۔ اس درمیان میں چھندواڑہ کے نظر بند سے جو مراسلت رہی اس کا دلچسپ ترین حصہ اس نظر بند کی شاعری و غزل گوئی سے متعلق ہے۔ دنیا اُس وقت تک محمد علی کو انگریزی کا ادیب جانتی تھی۔ اردو کے شاعر کی حیثیت

سے واقف نہ تھی۔ میرے فخر کے لئے یہ کافی ہے کہ جوہر کا جوہر شاعری سب سے پہلے مجھی پر ظاہر ہوا۔ اور پھر اول اول میں ہی اس کی اشاعت کا ذریعہ بنا۔ جس روز کوئی مکتوب محمد علی ڈاک میں ہوتا۔ وہ دن گویا یوم عید ہوتا۔ مکتوب سلطان جہاں منزل (دفتر کانفرنس) کے ہال میں باآواز بلند پڑھا جاتا۔ محمود احمد صاحب عباسی منشی انوار احمد صاحب سب اپنا کام چھوڑ چھاڑ اسی طرف متوجہ ہو جاتے۔ ایک ایک شعر پر واہ واہ کی دھوم مچتی، اور دفتر کا خشک کاروبار کچھ دیر کے لئے بزم شعر کی رنگینیوں میں تبدیل ہو جاتا! ۱۶ برس گزر جانے کے بعد بعض بعض شعر آج اور اس وقت بھی بیساختہ یاد آئے جاتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مطلع بے مثل کہا ہے ؎

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

اور یہ شعر تو اُردو زبان میں گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس شعر نے خدا جانے کتنوں کی مایوسیوں کو امید رحمت سے بدل دیا ؎

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

عاشقانہ رنگ میں یہ بھی خوب فرمایا ہے کیا برابر کی چوٹ ہے۔

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اور اس شعر نے تو ہر سننے والے کو تڑپا دیا ؎

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

ایک غزل غالب کی غزل تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی پر تھی ؎

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی اسقدر ظلم پہ موقوف ہے کیا، اور سہی
رب عزت کیلئے بھی کوئی رہنے دو خطاب تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان بھی ہے پروانہ صفت شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

ایک غزل شیفتہ کی مرغوب زمین میں تھی۔ اور درد دل کی ترجمان۔ گویا آپ بیتی منظوم ؎

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ | دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا | اس سادگی پر شوخی خونِ شہدا دیکھ
تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور | بیچارگی پر اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ
ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے | اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

اور اس غزل "مارو دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور" کا یہ شعر تو اب معلوم ہوتا ہے۔ کہ الہامی ہی تھا ؎

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں
مارو دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

محمد علی سے مراسلت رکھنا بھی ایک نعمت تھی، خطوط زیادہ نہیں لکھتے تھے، اور پابندی سے لکھنے پر تو کبھی بھی قادر نہ ہو سکے۔ کئی کئی دن ہی نہیں، کئی کئی ہفتے گزر جاتے، اور ضروری سے ضروری خط جواب کی نیت سے جیب میں یا میز کی ڈرائر میں پڑے کے پڑے رہ جاتے، یہاں تک کہ جب بہت زائد دیر ہونے لگتی، تو بجائے خط کے تار دیدیتے! زبانی گفتگو کی طرح خطوط بھی ہمیشہ مفصل لکھنے کی نیت رکھتے، اور اس کے لئے فرصت شاذ و نادر ہی ہاتھ آتی لیکن خط جب کبھی بھی لکھتے، پچھلے انتظار کا کفارہ پوری طرح کر دیتے۔ اللہ نے عجب جامع شخصیت بنائی تھی تاریخی، ادبی، مذہبی، شعری، سیاسی، تعلیمی، ہر موضوع پر یکساں تیار، نہایت ہی آزاد دماغ، حافظہ اور ذہانت دونوں بے مثل۔ ہنسنے ہنسانے والے غضب کے، اور رونے رلانے والا آدمی بھی ایسا کم دیکھنے میں آیا۔ یہی شخصیت خطوط میں جھلکتی رہتی۔ ہر خط باغ و بہار، نصیحت نامہ کا نصیحت نامہ، اور پھر دلکش و شگفتہ نظر بندی کا سب سے زیادہ زمانہ چھندواڑہ میں گزرا۔ آج کنعان کا نام اگر دنیا میں مشہور ہے تو نبی برحق یوسفؑ کے صدقہ میں۔ چھندواڑہ کا نام اگر کانوں میں پڑا، تو علی برادران ہی کے سلسلہ میں۔ یہ شہر اس زمانہ میں اچھا خاصہ ایک زیارت گاہ بن گیا تھا۔ گویا کسی ویرانہ میں کسی بزرگ کی درگاہ ہے۔ اور خوش عقیدہ مخلوق ہے کہ کھنچی چلی جا رہی ہے۔ محمد علی کا نام ابھی تک گھر گھر عوام کے زبان زد نہیں ہوا تھا لیکن خواص میں ایک ایک کی زبان پر تھا۔ پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ دُور دُور سے جوق جوق درشن

اور زیارت کیلئے مع تحفہ تحائف کے کھنچ کھنچ کر پہونچ رہے تھے۔ محمد علی کا خاص مشغلہ اُس وقت تلاوت وحفظ قرآن تھا۔ اور یہ اسی دور کی برکت تھی، کہ محمد علی گویا نیم حافظ قرآن ہوگئے تھے یعنی جس طرح نوآموز حافظوں کو کلام پاک کچا کچا یاد ہوتا ہے، انھیں بھی یاد ہوگیا تھا۔ جو وقت حفظ وتلاوت سے، اور مہمانوں کی خاطرداریوں سے بچتا اسی میں خطوط لکھتے۔ اور جن کے پاس خطوط آتے، وہ اپنے کو خوش قسمت سمجھتے، اور فخر ومباہات سے اس کا ذکر دوسروں سے کرتے۔ میرے پاس ۱۶ء سے ۱۸ء تک کے متعدد خطوط، میرے عریضوں کے جواب میں، موصول ہوئے، ایک سے بڑھ کر ایک پر تکلف۔ جتنے محفوظ رہ گئے ان صفحات میں درج ہو چکے ہیں۔ میں اُس وقت تک انگریزیت میں غرق تھا۔ اسلام سے بیگانہ اور مذہب کا دشمن، ایڈیٹر کامریڈ کا معتقد صرف اُن کے زور قلم اور انگریزی انشا پردازی کی بنا پر تھا ایک بار ۱۶ء میں اپنے نزدیک بڑی ہوا خواہی اور خلوص کے ساتھ لکھا کہ فن تاریخ کے آپ جید عالم ہیں، یہ جبریہ فرصت کا زمانہ ضائع کیوں ہو۔ کیوں نہ اس وقت کوئی تاریخ مرتب کر ڈالئے جواب آیا۔

"یہ وقت تاریخ نگاری کا ہے یا تاریخ سازی کا! اغیار تاریخ بنا رہے ہیں اور تم مجھے تاریخ لکھنے کی صلاح دے رہے ہو! عالم اسلام کی بربادیوں نے دل ودماغ میں وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے جو میں تصنیف وتالیف پر متوجہ ہو سکوں!"

اور یہ بالکل سچ تھا۔ عالم اسلامی خصوصاً ترکیہ (جو اُس وقت تک خلافت کی مترادف تھی) کی بربادیوں نے اس ہندی کا دل خون کر رکھا تھا۔ شاعر نے تو اپنی شاعری کی رو میں کہا ہے۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

محمد علی کے ہاں یہ شاعری، واقعہ تھی، دنیا کے کسی گوشہ میں کسی مسلمان کے جسم میں پھانس لگتی! اور اس کی چبھن محمد علی کے دل میں ہونے لگتی!

نومبر ۱۹۱۵ء میں علی برادران لینسڈون سے چھندواڑہ جاتے وقت لکھنو سے گزرے تھے اور اسٹیشن پر سرسری نیاز محمد علی سے حاصل ہوا تھا (میں اپنے "علم" کے نشہ میں مست، عرصہ تک شوکت صاحب کو خاطر میں نہ لاتا، بلکہ ان سے ملنا یا راہ و رسم پیدا کرنا اپنے "علم" کے لئے باعث توہین سمجھتا تھا) پولیس کی روک تھام اور سختیوں کے باعث بہت کم لوگ باریاب ہو سکے تھے۔ شروع ۱۹۱۹ء میں دونوں بھائیوں کو کسی خانگی ضرورت کی بنا پر رامپور جانے کی اجازت ملی۔ راستہ وہی لکھنو ہو کر تھا۔ شاید جنوری کا مہینہ تھا پنجاب میل لکھنو اسٹیشن پر ۲۵۔۳۰ منٹ ٹھہرتا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہی پہلے دونوں بھائی مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور کی طرف قدمبوسی کے لئے لپکے، اُدھر سے اسی تیزی کے ساتھ خود مولانا بھی ان دونوں کے قدم لینے کو بڑھے، اور خاصی کشمکش شروع ہوئی۔ ان کو اُن کے قدم لینے پر اصرار تھا، اور اُن کو ان کے۔ ضابطے سے مولانا مرشد تھے۔ اور یہ دونوں بھائی مرید۔ لیکن باہمی برتاؤ دیکھ کر دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا مشکل تھا، کہ پیر کون ہے اور مرید کون؟ ندوہ کے طلبہ بھی بڑی تعداد میں تھے۔ محمد علی نے فوراً سورۂ یوسف کے پندرہویں رکوع کی فرمائش کر دی۔ کلام پاک کے اتنے ٹکڑے کے ساتھ محمد علی کو خاص عشق تھا اور خاص کر ان دو آیات پر تو وجد کرتے رہتے تھے۔

یا صاحبی السجن، ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار، ما تعبدون من دونہ الا اسماءً سمیتموہا انتم و اباؤکم ما انزل اللہ بہا من سلطٰن ان الحکم الا للہ، امر الا تعبدوا الا ایاہ ذالک الدین القیم، ولکن اکثر الناس لایعلمون۔	اے جیل کے دونوں رفیقو، یہ بتاؤ کہ الگ الگ معبود اچھے ہیں، یا اکیلا اللہ جو سب سے بالاتر ہے؟ (یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ) تم اُسے چھوڑ کر صرف ناموں کی پوجا کرتے ہو جنھیں تم نے اور تمہارے بڑوں نے گڑھ رکھا ہے اللہ نے تو کوئی دلیل انکی اتاری نہیں، حکومت

بجز اللہ کے اور کسی کی نہیں۔ اس کا حکم ہے، کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، پر (افسوس ہے کہ) اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

یہ آیتیں سن کر ہاتھ پیر پٹختے تھے، روتے تھے، سر دھنتے تھے، معلوم ہوتا تھا،

کہ کلام اُن کے لئے قال نہیں رہا ہے۔ حال بن گیا ہے۔ بہر حال فرمائش کی تعمیل ایک خوش الحان طالب علم نے کی۔ سہ پہر کا وقت پنجاب میل کی گاڑی اور لکھنؤ اسٹیشن کا پہلا پلیٹ فارم مشتاقانِ دید کا اچھا خاصہ ہجوم، سب اردگرد حلقہ باندھے درمیان میں محمد علی۔ کلام پاک خوش الحانی سے پڑھا جا رہا ہے۔ اور محمد علی کی آنکھیں پرنم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اتنی دور نہ غل نہ غپاڑہ نہ شور نہ ہنگامہ، سب کے سب خاموشی کے ساتھ صورت تصویر! انگریز مسافر اور انگریز حکام دور کھڑے ہوئے حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ ریل چھوٹنے پر ہوئی اور قرأت موقوف۔ محمد علی اگر کوئی بہتر سے بہتر تقریر کرتے تو بھی شاید اسقدر موثر سماں نہ بندھ سکتا! ریل چلی تو میں بھی ساتھ ہو لیا۔ اور سندیلہ تک ساتھ ہو گیا۔ شوکت علی غریب نے کئی بار اپنی طرف مخاطب کرنا چاہا۔ میری خود بینی نے اسے روا نہ رکھا اب جب خیال آتا ہے تو خود اپنے اوپر نفریں کرتا ہوں بحث مباحثہ جو کچھ بھی رہا۔ محمد علی ہی سے ہوتا رہا۔ اپنے کسی خط میں میں نے یہ بیہودہ فقرہ لکھ دیا تھا کہ "سنا ہے آپ قرآن رٹ رہے ہیں (اللہ ان گستاخیوں کو معاف کرے) قوم میں بہت سے حافظ غلام رسول اور حافظ نبی بخش پہلے سے موجود ہیں ضرورت اس وقت کامریڈ کے اڈیٹری کی ہے" بس اسی فقرہ پر میری لے دے شروع ہوئی اور خوب خوب جوابات ملتے رہے۔ دار المصنفین اور مولانا سلیمان ندوی کا بھی ذکر خیر رہا۔ اتنا فرمانا مجھے اب بھی یاد ہے کہ "ابکی باہر نکلنے پر سید سلیمان سے کام لیتا ہے"

چند روز کے بعد رامپور سے واپسی ہوئی۔ ابکی بھی میں نے اسٹیشن کی حاضری کو کافی نہ سمجھا۔ رائے بریلی تک ہمراہ گیا۔ درجہ خالی تھا۔ باتوں کا خوب موقع تھا۔ محمد علی کی آواز پڑی ہوئی۔ گلا بیٹھا ہوا۔ خدا معلوم میری طرح کتنے اور بکواس کرنے والے پہلے مل چکے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے محمد علی تبلیغ ہر شخص کو کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آواز کھولنے والی گولیاں ساتھ میں تھیں اُن کے سہارے، مجھے قائل کرنے پر پوری طرح آمادہ ہو گئے، اور اپنی آواز گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ پر برابر غالب رکھی۔ نظر بندی سے رہائی کی افواہیں اُس زمانہ میں مشہور ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ "رہائی کے بعد ہمدرد و کامریڈ کے اجرا کا کب تک خیال ہے؟ کہا کہ "نہیں سردست، اخبارات کا

خیال تو نہیں، آزاد ہو کر سب سے پہلے دورہ کرنا ہے اور تقریروں کے ذریعہ سے تبلیغ کرنی ہے۔ ہندوستان کے اندر بھی اور ہندوستان کے باہر بھی۔" جب رائے بریلی کا اسٹیشن آنے لگا تو موضوع شعر و سخن کا شروع ہوا۔ اور چلتے چلاتے، اپنی نظم شہدائے کلکتہ پر سنائی۔ ۱۹۱۸ء میں کلکتہ کے متعدد مسلمان ایک بلوہ میں گولیاں کھا کر شہید ہوئے تھے۔ اس پر یہ نظم چھندواڑہ میں کہی تھی۔ دو ایک شعر آپ بھی سُن لیں۔

روح رسول آج ہے مہمان کلکتہ — اللہ نے بڑھائی ہے کیا شان کلکتہ
ہے آجکل بہار پہ ایمان کلکتہ — ہر سُو ہیں لاشہ ہائے شہیدانِ پُر خروش
میزانِ حشر بن گئی میزان کلکتہ — ہے امتحاں منافق و مومن کا دوستو

۱۹۱۹ء ختم ہو رہا تھا۔ جب رہائی کا حکم ملا۔ دونوں بھائی امرتسر پہونچے اور کانگریس میں پہلی بار شریک ہوئے۔ ان کی شرکت ساری قوم کی شرکت تھی۔ مسلمان قوم اب تک کانگرس سے علحدہ تھی، اور چند سال ادھر تو ہوا سمجھ کر اس کے نام تک سے کانوں پر ہاتھ رکھتی تھی۔ دو چار، دس، پانچ "نیشنلسٹ" مسلمان اگر جیوٹ کر کے شریک ہوئے بھی تو کیا۔ بس شرکت انھیں مٹھی بھر افراد تک محدود رہی۔ عام مسلمانوں کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ خیر یہ دونوں بھائی خود بھی کانگرس میں آئے۔ اور اپنے ساتھ مسلمانوں کو بھی لیکر آئے اور اس کے بعد ہی لکھنو اپنے پیر و مرشد سے ملنے آئے۔ سلسلہ بیعت میں ابھی اسی نظر بندی کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے۔ لکھنو میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی مغفور کی ذات عجب جامع صفات تھی۔ فیاضی، سیر چشمی، مہمان نوازی، خلق و مروت میں اپنی نظیر آپ۔ دسترخوان کی وسعت، دوست و دشمن، موافق و مخالف کی تفریق سے نا آشنا۔ فرنگی محل کا وسیع مکان، مشہور محلسرائے کے نام سے ہے۔ مرحوم کے زمانہ میں اس کا صحیح نام مہمان سرائے ہونا تھا برادران کا استقبال خوب دھوم دھام سے ہوا۔ جلوس، شہر کا گشت کرتا کراتا۔ سہ پہر کو فرنگی محل پہونچا۔ محلسرا میں جلسہ منعقد ہوا۔ چائے۔ ایڈریس، تقریریں سب ہی لوازمہ موجود۔ خلقت کا ہجوم سب سے مستزاد جلسہ کی حیثیت خانگی تھی۔ صرف مخصوصین مدعو

تھے۔ لیکن عقیدتمندی کے سیلاب کو کون روکتا، اور عوام اپنے کو خواص سے پیچھے کیوں رکھتے
وسیع صحن کا گوشہ گوشہ ہجوم سے اٹ گیا۔ میں و بکا دبکایا ایک کونے میں بیٹھا ہوا۔ محمد علی
کی نظر پڑی اور نظر پڑتے ہی وہاں تاب کب تھی۔ نہ مجمع کا لحاظ نہ اپنے مرتبہ کا پاس۔ جھٹ
اپنی کرسی سے اٹھ ادھر بڑھنے لگے۔ میں لپک کر فوراً پہونچ گیا۔ وہیں بھینچ بھینچ کر لپٹگیر ہونے
لگے۔ ———— میں دکھا یہ رہا ہوں کہ تصنع کہیں چھو نہیں گیا تھا۔ اور جسے
عرف عام میں، اپنے کو ئے دیئے رہنا کہتے ہیں۔ اُس کے تو وہ قریب بھی ہو کر نہیں گزرے
تھے۔ قبول خلائق اور مرجعیت کے اس بلند مرتبہ پر پہونچکر بھی اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نیاز
مندوں سے خلوت ہو یا جلوت، سب کہیں یکساں بے تکلفی کے ساتھ خود ہی بڑھ بڑھ کر
ملتے ———— غالباً لکھنو کے اسی سفر میں فرنگی محل سے "مولانا کی باضابطہ سند
عطا ہوئی۔ وفد خلافت محمد علی کی صدارت میں یورپ کے لئے فروری ۱۹۲۰ء میں روانہ
ہوا۔ خیال ایسا پڑتا ہے کہ بمبئی لکھنو ہی سے روانگی ہوئی۔ ارکان وفد، مولانا سید سلیمان ندوی
اور مسٹر سید حسین قرار پائے۔ اور حیات صاحب سکرٹری۔

شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپس آئے۔ اور چند ہی روز کے بعد
مع گاندھی جی۔ اور مولانا شوکت علی کے لکھنو وارد ہوئے۔ ترک موالات کی تحریک اس
اثنا میں خوب پھیل چکی تھی، اور ملک کا چپہ چپہ "گاندھی جی کی جے" اور محمد علی شوکت علی
کی جے" سے گونج رہا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے ہندوؤں تک کی زبان پر چڑھے ہوئے۔ گاندھی
جی مع برادران کے صبح دن نکلتے ہوتے لکھنو اسٹیشن پہونچے۔ آج کے ہجوم کا کیا کہنا۔ گاندھی
جی نے کہا کہ جب تک جیقلش ختم ہو کر ایک باقاعدہ راستہ نہ بن لیگا۔ میں گاڑی سے نہ
اتروں گا۔ دیکھنے کے قابل یہ وقت تھا۔ محمد علی عام خلقت کی نظر میں اسوقت گاندھی
جی کے بالکل ہم پلہ نہ سہی تو کچھ یوں ہی سے کم تھے۔ لیکن راستہ صاف کرنے کے لئے
محمد علی ہی اُترے۔ اور چاروں طرف چیخ چیخ کر اور دوڑ دوڑ کر اس طرح کام کرنا شروع
کیا، کہ گویا برابر کے لیڈر نہیں۔ بلکہ ایک معمولی والنٹیر ہیں۔ یا ایک کا ہاتھ پکڑا، دوسرے کو

گھسیٹنا۔ اس پر چلائے۔ اُس سے لجاجت کی یہ کام منٹ دو منٹ کا نہ تھا۔ مجمع سا مجمع تھا! ۲۰-۲۵ منٹ سے کیا کم وقت ہوگا۔ محمد علی کے چہرہ مہرہ، لہجہ بشرہ، کسی چیز سے بھی یہ نہیں ظاہر ہوتا تھا، کہ یہ اپنے کو بھی کسی درجہ کا لیڈر یا مخدوم سمجھتے ہیں بس محض ایک خادم کی حیثیت! میں نے اپنی ساری عمر میں، کسی ایک لیڈر کو بھی اپنی شخصیت دوسرے لیڈر کے سامنے اس طرح فنا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ اس واقعہ کے قبل نہ اس واقعہ کے بعد، اور مسلمان لیڈروں میں تو خیر کیا ہندو لیڈروں میں بھی اس کی مثال دیکھنے میں نہ آئی!

اب محمد علی کامریڈ کے ایڈیٹر نہ تھے۔ گاندھی جی کے ہم پلہ وہمدوش آل انڈیا لیڈر تھے۔ سر جیمس مسٹن (گورنر یوپی) کی دوستی سر کے فلیٹ وڈلسن (فنانس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا) کی یاری۔ ختم ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں۔ اب حکومت کے وہ شدید ترین دشمن، اور حکومت اُن کی شدید ترین دشمن تھی۔ خلقت ان کے اوپر پروانہ وار گری تھی۔ اور دن رات مشکل ہی سے کوئی وقت ایسا نکلتا، جسے وہ اپنا کہہ سکتے۔ عوام وخواص سب ہی کی باگ اُس وقت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ عوام دل سے فریفتہ، اور خواص بادل ناخواستہ مصلحت وقت کے تقاضہ سے گرویدہ۔ راجہ صاحب محمود آباد بھی اعلیٰ درجہ کے سیر چشم فیاض اور مہمان نواز رئیس تھے۔ لیکن بہرحال رئیس تھے، راجہ تھے، انگریزی اصطلاح میں ارسٹاکریٹ تھے۔ ایسے عوام پسند لیڈروں کی جگہ اُن کے ہاں نکلنی مشکل تھی ان کی شاہانہ ملاقات اور مہمان نوازیوں کے پورے لطف اٹھانے کے لئے موتی لال نہرو سر تیج بہادر سپرو۔ سر علی امام اور مسٹر جنا کیا کم تھے۔ گاندھی اور علی برادران کے لئے وہی فرنگی محل کی مہمان سرا کافی ہوئی۔ محلسرا خاصی وسیع تھی۔ محلسرا کے مالک کا قلب اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ مولانا عبدالباری مرحوم کے ہاں فقیری میں ایک شاہی شان، صبح سے شام، اور شام سے آدھی رات تک ایک میلہ سا لگا ہوا۔ گاندھی جی کے لئے تو پھر بھی تنہائی کا انتظام، حاجب و دربان کا اہتمام، لیکن برادران تمام تر وقف عام۔ جب دیکھئے۔ لوگوں میں گھرے ہوئے بحث ومباحثہ، قیل وقال میں معروف خدا معلوم غسل وطہارت، آرام واستراحت، کے لئے کونسا وقت اور کب نکالتے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا۔ کہ مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ ماڈرن ریویو (کلکتہ) میں میں اسی زمانہ میں میرا ایک مفصل انگریزی مضمون ستیا گرہ اور اسلام کے عنوان سے نکلا تھا۔ جس میں آیات قرآنی سے یہ دکھایا گیا تھا۔ کہ ستیا گرہ کی تعلیم تمام تر کلام مجید میں موجود ہے۔ غالب نے "تقریب بہر ملاقات" کے لئے "مصوری" سیکھنی شروع کی تھی۔ یہاں تقریب کے لئے اس تازہ مضمون کو کام میں لایا گیا۔ دوسرے دن سہ پہر کو لیڈروں کی پارٹی شاہجہان پور و بریلی کی طرف روانہ ہوئی۔ میں ابھی بھی سندیلہ تک ہمراہ ہولیا۔ اتفاق سے مولانا ابوالکلام صاحب بھی اسی ٹرین سے کلکتہ سے آرہے تھے۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی انھیں کے ڈبہ میں بیٹھے شوکت صاحب کو کہیں اور جگہ ملی۔ گاندھی جی تھک کے چور ہو چکے تھے۔ گاڑی چلتے ہی ایک برتھ پر سو نے لیٹ گئے۔ بیچ والی برتھ پر محمد علی وابوالکلام۔ انھیں کی خدمت میں میں بھی حاضر۔ ماڈرن ریویو کا پرچہ ہاتھ میں تھا۔ مولانا محمد علی نے اُسے لے لیا۔ اور چند ہی سطریں پڑھنے کے بعد اس پر بحث شروع فرمادی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن کا اصلی وعدہ اپنے پیرووں سے روحانی حکومت یا آسمانی بادشاہت کا ہے۔ وہ فرمارہے تھے کہ نہیں۔ اسلام اس مادی دنیا میں بھی پوری طرح غالب وحکمران رہنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام بھی انھیں کے ہمنوا۔ گاندھی جی کچھ سوتے۔ کچھ جاگتے جاتے ہیں اور کبھی کبھی مسکرا دیتے ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں یہ پر لطف صحبت ختم ہوگئی۔ میرا اسٹیشن آگیا اور گاڑی آگے کو روانہ ہوگئی۔ عقیدتمندوں کا ریلا اس چھوٹے سے اسٹیشن پر بھی آیا۔ مولانا محمد علی کی پوری کوشش کہ مہاتما جی کو کوئی زحمت نہ ہونے پائے۔ ان کے آرام میں خلل نہ پڑنے پائے۔ خود ہر زحمت برداشت کر لینے کو موجود گاندھی جی کا ایثار اس میں شبہ نہیں کہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ اور ضرب المثل کی شہرت رکھتا ہے لیکن روزمرہ کی چھوٹی سی چھوٹی باتوں میں محمد علی نے اپنے کو جس جس طرح ان کے سامنے دبایا اور مٹایا۔ اس کی نظیر بھی ملنی آسان نہیں۔

اس کے بعد ہی متحدہ حملہ علیگڈھ پر ہوا۔ اور محمد علی نے جامعہ ملیہ (آج اس

کھلی ہوئی حقیقت کو بھی یاد دلانے کی ضرورت ہے) محض اپنی سعی و توت سے قائم کی۔ محمد علی کو علیگڈھ سے محبت نہیں عشق تھا۔ خدا معلوم اس وقت دل پر کیا گزر رہی ہوگی دور بیٹھا ہوا یہ حالات سنتا رہا۔ جب ذرا فرصت ہوئی تو ۱۹۲۱ء کے شروع ہی میں اس نیاز مند کی یاد ہوئی۔ حکم ہوا کہ فلسفہ پڑھانے کے لئے آؤ۔ لیکن آنے سے قبل اپنے عقائد کی طرف سے اطمینان دلا دو۔ بحمداللہ اسوقت تک میرے عقائد درست ہو چکے تھے۔ لیکن محمد علی صاحب کو اس کا تفصیلی علم نہ تھا خط کا یہ فقرہ مجھے نہیں بھولتا کہ "علم مجھے عزیز ہے۔ مگر مذہب علم سے زیادہ عزیز ہے۔ اللہ اللہ محمد علی کے سوا کوئی بھی دوسرا ہوتا تو اتنے ذاتی تعلقات اور اتنی خوش ظنی کے بعد جو انھیں میری فلسفہ دانی سے تھی۔ (خواہ وہ بالکل غلط ہی سہی) ناممکن تھا کہ میرے بلانے کے لئے کچھ شرائط لگاتا۔ مذہب اور اللہ کے دین کا یہ گہرا درد محمد علی ہی کے دل میں تھا کہ مجھے بلاتے بھی ہیں۔ لیکن اس کے ذرا بھی روادار نہیں کہ میں الحاد و دہریت کے جراثیم لئے ہوئے مسلمانوں کی درسگاہ میں پہونچوں میں نے اپنے تجربہ میں اپنے جتنے مہربان دیکھے سب بس دو ہی قسم کے پائے۔ یا دوست یا دشمن یا موافق یا مخالف اگر دوست ہیں تو میری مروت میں میرے ہر عیب پر پردہ ڈالنے کو تیار اور اگر خفا ہیں تو ہر شئے پر اعتراض ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ جوہر یکتا صرف محمد علی ہی میں پایا۔ کہ اس زمانہ میں بھی ذاتی طور پر مجھ پر نہایت مہربان لیکن میرے دینی عقائد سے اسی درجہ بیزار ہر وقت میری اصلاح کی کوشش ہر موقع پر میرے اوپر سلام صحیح تبلیغ۔

۱۹۲۱ء علی برادران کے شباب شہرت کا سن تھا۔ گاندھی جی کے ہمراہ اس لق و دق ملک ہندوستان کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ آج کلکتہ میں ہیں۔ تو کل دہلی میں ابھی لاہور میں تھے، ابھی امرتسر پہونچے۔ شہر شہر بلکہ قصبہ قصبہ پہونچے۔ اور جہاں کہیں پہونچے نام کی شہرت استقبال کے لئے پیشتر ہی سے موجود ہوتی۔ آخر فروری ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ میں صوبہ کی خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ میں اسی زمانہ میں لکھنؤ کی مستقل سکونت ترک کر کے اپنے وطن قصبہ دریاباد کو منتقل ہو آیا۔ سیاسی جلسوں اور ہنگاموں

سے اسوقت مطلق دلچسپی نہ تھی مگر محمد علی کی آمد سن کر لکھنؤ جانا فرض ہوگیا۔ محمد علی
اس وقت تک بہت تبدیل ہو چکے تھے۔ خطبہ صدارت لکھنے کی فرصت کسے تھی۔ کئی
گھنٹے میں زبانی ارشاد ہوا۔ تقریر کیا تھی۔ ایک نالۂ درد تھی، بات بات میں خود روتے، اور
دوسروں کو رلاتے۔ جلسہ دو دن رہا۔ مجھ سے حسب معمول وہی بحث و مباحثہ قیل و قال
جلسہ کے باہر بھی اور محلسرا فرنگی محل کے اندر بھی۔ اچھے اچھے وکیل اور بیرسٹر گھنٹوں باریابی
کے منتظر رہتے۔ اور محمد علی دوسری طرف مشغول۔ جلسہ میں جو اہم و مرکزی تجویز منظور
ہوئی تھی۔ اُس کے انگریزی ترجمے کا حکم مجھے ملا۔ مجھے تخت صدارت کے قریب بلایا۔
اور اپنے حسن ظن کی بناء پر ارشاد فرمایا، کہ "یہ تجویز بہت اہم ہے تار پر وزیر اعظم کے پاس
جائے گی۔ اس کا ترجمہ تم ہی کرو"۔ اتنی بڑی ذمہ داری کی اہمیت، اس نا اہل میں کب تھی
بڑی مشکلوں سے کام کو دوسروں پر ٹال کر، خود کھسک آیا۔ فرنگی محل میں دعوت حسب
معمول خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ اس کے ایک کا زمانہ پھر دہی مسلسل دورہ میں گزرنے
لگا۔ ساری فضا مہاتما گاندھی کی جے" اور "اللہ اکبر" کے ساتھ "محمد علی شوکت علی کی جے" کے
نعروں سے گونجتی ہوئی بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملک کی حکومت، گاندھی جی اور علی برادران
کے ہاتھ میں ہے، اور بے تاج کے تاجدار یہی تینوں حضرات ہیں۔ دیہات کے ٹھیٹھ
گنوار اخبار کی صورت تک سے بیخبر لیکن ان ناموں سے وہ بھی خوب واقف۔ شہرت
وہاں وہاں پہونچی، جہاں اس سے قبل نہ اس کے بعد نہ کسی لیڈر کی پہونچی تھی، نہ کسی
واعظ کی! فرق صرف اتنا تھا، کہ خواص کے علم میں محمد علی اور شوکت علی کے قالب دو
تھے، جان ایک لیکن عوام الناس کے علم میں دوئی اتنی بھی نہ تھی۔ جان بھی ایک تھی
اور قالب بھی ایک ہی! گویا شوکت علی دوسرا نام تھا ہی نہیں، بلکہ اکیلے محمد علی ہی کا پورا
نام تھا محمد علی شوکت علی!

ستمبر ۱۹۲۱ء کا آغاز تھا کہ محمد علی اور ... کے راستہ میں ریل پر گرفتار
ہوئے۔ اور مشہور و معروف تاریخی مقدمہ ... کراچی لائے گئے۔ ساتھ کے ملزمین حضرات

مولانا حسین احمد صاحب، مولانا شوکت علی، پیر غلام مجدد صاحب، وغیرہم تھے۔ ہمدم (لکھنؤ) کے مالک شیخ شاہد حسین مرحوم تعلقدار گدیہ تھے۔ انھیں علی برادران کے سیاسی خیالات سے کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ لیکن ایڈیٹر سید جالب مرحوم تھے۔ یہ مولانا محمدؐ علی کے ہمدرو میں کام کئے ہوئے تھے۔ اور مدتوں ان کے نام کے ساتھ "آف ہمدرد" لکھا جاتا رہا تھا۔ اس لئے ہمدم علی برادران کے حالات خاص طور پر بسط و تفصیل کے ساتھ چھاپتا رہتا۔ قوم کا مذاق اُس وقت مانگے سی چیز کو رہا تھا۔ اس میں ایک خانگی مکتوب مولانا محمدؐ علی کا کسی صاحب کے نام کا نکلا جس میں اپنی گرفتاری کی تفصیل والیئر سے کراچی تک کا سفرنامہ درج تھا۔ خط میں محمدؐ علی کا یہ کہنا کہ راہ کے طویل گھنٹے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے کٹ گئے۔ اور انھی غازی پوری کے اس شعر کی داد او تکرار سے

وہاں پہو نچکے یہ کہیو صبا سلام کے بعد   تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

بس کہہ نہیں سکتا ہوں کہ اس سیدھے سادے مکتوب میں کس درجہ اثر تھا! خط کی چند ہی سطریں پڑھی ہوں گی۔ کہ آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اور پھر تو آنسوؤں کا ایسا تار بندھا کہ خط کا آگے پڑھنا اور ختم کرنا مشکل ہوگیا۔ دنیا اُس وقت تک محمدؐ علی کو ایک سیاسی لیڈر سمجھ رہی تھی۔ یہ کیسا صریح ظلم تھا! جو اپنے کو رسول کی محبت میں فنا کر چکا تھا۔ اس کی بابت یہ رائے قائم کرنا اس کا منتہائے مقصود آزادی وطن ہے۔ اُس کے حق میں بھی ناانصافی تھی۔ اور اپنے حق میں بھی! مجسٹریٹ اور پھر جوڈیشل کمشنر کے سامنے جو بیانات محمدؐ علی نے دیئے اُن کا ایک ایک لفظ جوش ایمان کا ترجمان ہے۔ کوئی دو مہینے حوالات میں عام قیدیوں کی طرح بسر کرڈالے۔ نومبر میں حکم سنا دیا گیا۔ دو دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمدؐ علی کو بھی ہوئی! ——— اللہ اللہ عجیب عبرت کا سماں تھا! آکسفرڈ کا آنرز والا گریجویٹ۔ چوروں اور نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند تھا! جس کے ملنے والوں میں گورنر اور لفٹنٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکٹیو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے۔ اس کی عزت اس وقت ادنیٰ ادنیٰ پہرہ داروں اور برقندازوں کے رحم و کرم پر تھی! کوچ اور صوفے، گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھرا

فرش تھا اور غذا وہ مل رہی تھی۔ جو کبھی اُس کے چاکروں اور خدمتگاروں نے بھی نہیں کھائی تھی! اور یہ سب کچھ دعوائے اسلام کے جرم میں۔ محبت ایمان کی سزائیں! جو فردِ جرم کی لگی تھی۔ اُس میں سوراج، آزادی ہند وغیرہ کا کہیں نام نہ تھا۔ الزام یہ تھا! کہ مسلمان سپاہیوں تک احکام قرآنی کی تبلیغ کی کیوں کوشش کی تھی! تاریخ اپنے پیمانہ پہ سوا تیرہ سو برس کے بعد اپنا اعادہ کر رہی تھی۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولو ربنا اللّٰہ (حج - ۶) وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللّٰہ العزیز الحمید (البروج) اِن آیتوں کی تفسیر بلا وساطت لفظ و عبارت، آنکھوں کے سامنے۔

ستمبر ۲۱ء سے ستمبر ۲۳ء تک محمد علی پر کیا کیا گزری اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع، اور نہ یہ بیان مقصود۔ مختصر یہ کہ علاوہ حوالات اور جیل کی سختیوں کے سرکاری اور نیم سرکاری ایجنسیوں نے کوئی دقیقہ اُس وقت اس مظلوم پر ظلم کرنیکا اٹھا نہیں رکھا پانیر اور اسٹیٹمین اور لیڈر ہی نہیں، علاوہ انگریزی اور ہندو اخباروں کے، خدا جانے کتنے مسلمان اخبار نویسوں اور قلم کے مزدوروں کی روزی کھل گئی۔ صبح ہو یا شام جب دیکھیئے۔ محمد علی کے حق میں گالیاں تصنیف کر رہے ہیں۔ ہر افترا جائز اور ہر اتہام درست تھا۔ اشیر جب لوہے کی سلاخوں کے اندر بند ہوتا ہے۔ تو باہر سے چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی کچھ فاصلہ پر رہ کر لکڑی سے اسے کونچ سکتے ہیں! لیکن ایک طرف اگر یہ معاملات جاری تھے تو دوسری طرف۔ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودًّا (جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے۔ خدائے رحمٰن ان کے لئے عنقریب محبت پیدا کر دے گا) سے وعدہ کا بھی ظہور ہو کر رہتا تھا۔ کراچی کے قیدی کچھ روز کے بعد سب الگ الگ کر دیئے گئے۔ محمد علی کے حصہ میں بیجا پور (دکن) کا جیل آیا۔ بیجاپور کے قیدی کو اگر نا وقت چھینک تک آجاتی تو اس کی بھی خبر ملک کی فضا میں گونج جاتی نظمیں خدا جانے کتنی کہہ ڈالی گئیں۔ ایک نظم خود محمد علی ہی کی طرح مقبول ہوئی۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو۔ شہر شہر گلی گلی گاؤں گاؤں، بچہ بچہ کی زبان پر یہی ترانہ تھا "جان بیٹا

خلافت پہ دیدو" نظم میں کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں۔ غلطیاں تک موجود ہیں، شاعر بھی کوئی غیر معروف مجہول الحال ہے۔ پھر بھی کچھ وقت کا اثر، کچھ جذبات کی صداقت کچھ نظم کی دردانگیز دھن، مل ملا کر نظم کو وہ خداداد مقبولیت حاصل ہوئی جو بڑے بڑے جیداور نامور شاعروں کے کلام کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دو ایک بند ایسے تھے، جنکی صدا آج تک کان میں گونج رہی ہے ؎

بولیں اماں محمد علی کی ۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ساتھ تیرے ہی شوکت علی بھی ۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا ۔۔۔ کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا ۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے ۔۔۔ کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے ۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو
حشر میں حشر برپا کرونگی ۔۔۔ پیش حق تم کو لیکر چلونگی
اس حکومت پہ دعوی کرونگی ۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو

شام کا وقت ہے۔امین آباد کے چوراہے پر "صدائے خاتون" دو دو پیسے کو بک رہی ہے۔ خدا جانے کتنی تعداد میں روز نکلتی ہے۔ لڑکے دردناک آواز سے گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔ صدہا راہ گیر کھڑے سن رہے ہیں۔ پولیس کی لاری آتی ہے۔ بہتوں کو پکڑ پکڑ کر جیل خانہ پہونچا دیتی ہے۔ ہر روز سہ پہر سے لیکر رات گئے تک یہی تماشہ رہتا ہے جیل جانا ایک ہنسی کھیل ہو گیا ہے۔ پہلے جس کے نام سے لوگ تھراتے تھے۔ اب وہ ایک مذاق سا معلوم ہونے لگا ہے محمد علی کانگرس میں آئے تو قوم کو ساتھ لیکر آئے محمد علی جیل گئے تو یہی آگ قوم پر گلزار ہوگئی، سیکڑوں نہیں ہزارہا مسلمان، اچھے اچھے عالی خاندان، نوعمر و نوجوان معزز و تعلیمیافتہ وکیل و بیرسٹر۔ عالم و فاضل، ہنسی وخوشی جیل میں بھرتے چلے گئے!

شعر گوئی کی مہلت محمد علی کو قید یا نظر بندی ہی کے زمانہ میں ملتی، اور ان کی شاعری اسی وقت چمکتی۔ ۱۹۲۲ء کا غالباً وسط تھا۔ جب ان کی ایک نعتیہ غزل، جیل کے حدود سے نکل کر فرنگی محل پہونچی۔ اور وہیں سے مجھے ملی غزل کیا تھی، شاعر کے جذبات دل کی ترجمان۔ ایک ایک شعر درد، و تاثیر میں ڈوبا ہوا۔ ہاتھوں ہاتھ نقل ہوئی اور دیکھتے دیکھتے زبانوں پر چڑھ گئی۔ قوالوں نے اسے گایا، شاعروں نے اس پر غزلیں کہیں۔ رسائل و اخبارات اسے مدتوں شائع کرتے رہے۔ آپ بھی یقیناً سن چکے ہوں گے اس وقت قند مکرر کا لطف حاصل کریں ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفی ہے۔ ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجیں ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

خیر یہ غزل تو خوب ہی پھیلی، لیکن دوسری غزلوں کے بھی بعض بعض شعر کہنا چاہیئے کہ گویا الہامی ہیں۔ مہینوں کے صبر آزما انتظار کے بعد ستمبر ۱۹۲۲ء میں بالآخر ترکوں کو یونان پر فتح ہوتی ہے۔ اور مصطفےٰ کمال کی تلوار سمرنا پر قابض ہو جاتی ہے محمد علی مدت سے اخبارات کے مطالعہ سے محروم، آبادی شہر سے دور بیجاپور جیل کی بلند چار دیواری کے اندر بند ہیں۔ ایک روز دور سے اللہ اکبر کے نعروں کی آواز سنتے ہیں۔ دل از خود گواہی دے اٹھتا ہے۔ کہ ہو نہ ہو، ترکوں کی فتح کی خبر آئی ہے۔ معاً ایک پوری غزل، جوش

دل سے بیقرار ہو کر کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر دل ہی دل میں ڈرتے بھی جاتے ہیں کہ کہیں قیاس غلط نہ ہو۔ فراست ایمانی کہئے یا کشف، بہر حال بات سچ نکلی مطلع آج بھی سن کر آپ اچھل پڑیں گے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

بیشک قیدی گوشہ نشین کی سن لی گئی تھی۔ مطلع کے بعد ہی کہتے ہیں ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی!

ساری غزل، اسی رنگ میں مرصع ہے۔ اسی زمانہ کی وہ غزل بھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

آخر نہ لیکے عرش سے فتح و ظفر گئی
مظلوم کی دعا بھی کہیں بے اثر گئی

انکی جیل کا زمانہ سخت مصائب و شدائد کا زمانہ تھا محمد علی کا وزن شروع میں ۲-۱۳ سیر گھٹ گیا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کچھ ہی روز بعد "بڑے بھائی سے الگ کر کے وہ راجکوٹ جیل میں۔ اور یہ بیجاپور جیل میں رکھے گئے۔ ظرافت و شوق نگاری اس حال میں بھی رفیق رہی ایک غزل شیفتہ کی غزل پر کہی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

کیوں شہر چھوڑ جا بسیں دہقانیوں میں ہم
مجنوں کے ساتھ ہونگے بیابانیوں میں ہم

شوکت صاحب کا وزن کہیں زیادہ گھٹ گیا تھا ان کی زبان سے یہ شعر کہتے ہیں ؎

شوکت یہ کہتے ہیں "وہ تن و توش جب نہیں
پھر کیوں گنیں نہ اپنے کو روحانیوں میں ہم

شیروانی خاندان کے اکثر اکابر سے اُس وقت شدید اختلافات تھے۔ لیکن بعض افراد اسی خاندان کے مخلص رفیقوں میں بھی تھے۔ اُن کے حق میں سنیے ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہیں عقل بھی کبھی شیروانیوں میں ہم

ترکوں کی حمایت میں مسلمانوں نے ایک جیش انگورہ بھیجنے کی تجویز کی تھی۔ اس پر ایک

اینگلو انڈین کرنل گڈنی نے ایک جیش یونان بھرتی کرنے کی تحریک کی ایک مشہور خاندان بہادر کی زبان سے کہتے ہیں ؎

شرط وفا یہی ہے تقاضائے دیں یہی	گڈنی کے ساتھ جائیں یونانیوں میں ہم

سردی کے موسم میں جیل میں جو کھانا ملتا اُسے بچا کر رکھ لیتے۔ اور رات کے وقت لالٹین پر گرم کر کے کھاتے۔ جب گرم کر کے کھاتے تو اُسے "حریرہ" کہتے۔ جب ٹھنڈا اور جما ہوا ہوتا تو اس کا نام "زمہریرہ" رکھتے۔ کھانے کی مقدار ہی کیا ہوتی۔ لیکن فیاضی اور سیر چشمی کی یہ شان تھی کہ اس کھانے کو بھی تنہا نہ کھاتے۔ ساتھ کے قیدیوں کو بانٹنے کے بعد ہی کھاتے۔

محمدؐ علی کی زندگی ہی آزمایشوں میں گزری تھی۔ لیکن اب کی بار ایک بڑی کڑی آزمائش سے سابقہ پڑا۔ اولاد میں کوئی لڑکا نہ تھا۔ لڑکیاں چار تھیں، اور چاروں نہایت درجہ عزیز و محبوب، جو دوسروں کی اولاد پر اپنی جان نثار کرنے پر تیار رہتا تھا۔ وہ خود اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو کیسا کچھ عزیز نہ رکھتا۔ منجھلی صاحبزادی آمنہ مرحومہؒ نسبتہً اور زیادہ عزیز تھیں، جوان اور بیاہی ہوئی۔ محمدؐ علی ادھر بیجاپور جیل میں بند تھے۔ ادھر یہ بیمار پڑیں۔ اور مرض بالآخر دق تجویز ہوا! اطلاع پہونچی، تو دل مسوس کر رہ گئے۔ آزاد ہوتے تو دوا علاج کی دوڑ دھوپ میں زمین آسمان ایک کر دیتے۔ اسوقت اتنا بھی بس نہیں کہ ایک نظر آکر دیکھ ہی لیں۔ ایک نالۂ موزوں میں اپنے رب سے فریاد کی۔ پوری نظم اسی زمانہ میں، روزنامہ خلافت میں شاید پیام مجلس کے عنوان سے چھپ گئی تھی ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں	تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا	جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ساتویں شعر میں کلیجہ پر پتھر رکھ کر لاڈلی اور نازوں کی پالی بیٹی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎۔

تری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُسکو	نہیں منظور تو پھر ہمکو بھی منظور نہیں

دسواں شعر مناجات کے رنگ میں ہے ؎

تیری قدرت سے، خدایا، تری رحمت سے نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دُور نہیں

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی تلمیحات کے بعد،
چودھویں شعر میں یوں پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں ؎

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملادے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

اگست ۱۹۲۳ء کی آخری تاریخیں تھیں، جب رہا ہوئے۔ اور غالباً جھانسی اسٹیشن پر لا کر آزاد کئے گئے۔ سارے ملک میں ایک جشن مسرت وشادمانی برپا ہوگیا۔ مولانا سیدھے دلی پہونچے۔ اسپیشل کانگرس کا جلسہ تھا۔ سواراجیوں اور "نو چینجرز" کے درمیان زبردست معرکہ ہونیوالا تھا۔ مولانا ہی کی کوشش سے جوں توں کر کے مصالحت ہوئی۔ آمنہ مرحومہ بھوالی پہاڑ پر زیر علاج تھیں۔ دلی سے فارغ ہو کر وہاں پہونچے۔ میں ملنے کے لئے بیتاب تھا۔ معتبر دوستوں سے سن چکا تھا کہ جیل سے نور مجسم ہو کر نکلے ہیں۔ دلی میں مجمع کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ بھوالی ہی میں بہ اطمینان ملاقات کی امید نظر آئی۔ شروع نومبر کی کوئی تاریخ تھی، جب بھوالی روانہ ہوا، کاٹھ گودام اسٹیشن سے لاری پر روانہ ہوا۔ جمعہ کا دن تھا۔ اور دوپہر کا وقت، راستہ میں ایک مسجد میں نماز جمعہ پڑھی۔ بھوالی مولانا کی قیام گاہ پر دو بجے کے بعد پہونچا۔ معلوم ہوا ابھی جمعہ پڑھ کر واپس نہیں آئے ہیں۔ انتظار کرتے کرتے چار بج گئے۔ جب کہیں جا کر واپس آئے۔ میں اشتیاق میں دو تین فرلانگ استقبال کے لئے بڑھ گیا تھا۔ دیکھا کہ تشریف لا رہے ہیں۔ اور مسجد کے امام صاحب بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ اُن سے سرگرم مباحثہ میں منہمک مسجد ہی کے سلسلہ میں کوئی انتظام درپیش تھا۔ اور اسی کے باب میں اتنا جوش و انہماک تھا۔ بھوالی کوئی مرکزی مقام نہیں ایک دور افتادہ مقام۔ مسلمان نہ صاحب وجاہت نہ کسی بڑی تعداد میں۔ لیکن محمد علی کو ان چیزوں کی پرواہی کب تھی۔ چھوٹا یا بڑا، کوئی سا بھی کام مسلمانوں کا ہو بس اُن کے جوش وانہماک کے لئے یہ کافی تھا کہ کام مسلمانوں

کا ہے۔ شہر اور گاؤں سب ان کی نظر میں ایک! جس قدر میں ان کا مشتاق تھا، اسی قدر خود بھی میرے مشتاق تھے لیکن بحث کے انہماک میں کیسی دوستی اور کس کی ملاقات دس منٹ، بیس منٹ، خدا جانے کتنی دیر ہوگئی۔ کہ میں منتظر کھڑا ہوا ہوں۔ اور وہ مجھے دیکھ چکنے کے باوجود اسی سرگرمی کے ساتھ بحث میں جٹے ہوئے۔ جب جی بھر کر تقریر و استدلال سے فارغ ہولئے۔ جب جاکر میری طرف ملتفت ہوئے۔ اور اُس وقت کے التفات کا کیا پوچھنا! معلوم ہوتا تھا کہ محبت کے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے اور چشمہ ہے کہ اُبلا پڑتا ہے۔

طویل یکجائی اور لطف صحبت کا موقع پہلی بار ملا۔ محمد علی اپنی اولاد کے حق میں محض باپ نہ تھے۔ ماں سے بھی بڑھ کر تھے۔ جان کے برابر عزیز بیٹی کی تیمارداری، وقت پر دوا پلانا، پرہیزی غذا کھلانا۔ سب کچھ خود ہی کرتے تھے۔ جیل سے باہر آتے ہی، قوم کا حکم ملا تھا، کہ سب سے بڑا قومی منصب یعنے کانگرس کی صدارت سال آیندہ کے لئے قبول کریں۔ گاندھی جی ابھی تک جیل میں تھے، ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر اس وقت محمد علی ہی تھے۔ ڈاک کا انبار، تار برقیوں کا ہجوم، ملنے والوں اور سیاسی کارکنوں کی اس وقت بھوالی جیسے دور افتادہ مقام میں بھی کمی نہ تھی۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود میزبانی اور مہمان نوازی کے جوش میں ذرا کمی نہیں۔ لاڈلی اور چہیتی جوان لڑکی، دق میں مبتلا، صاحب فراش ہے۔ دیکھتے دیکھتے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ غمزدہ باپ نے پورے دو برس کے بعد دیکھا ہے۔ باتیں کرتے کرتے بیقرار ہوکر، دوا پلانے یا بیٹی کا دل بہلانے کے لئے اندر اٹھ کر چلے جاتے ہیں پھر کچھ دیر کے بعد باہر آجاتے ہیں ملنے والے، آنے جانے والے مسلمان تو مسلمان، ہندوؤں کو کھانے کی دعوت دے رہے ہیں، اور زبردستی کھینچ کھینچ کر دسترخوان پر بٹھا رہے ہیں۔ حد اعتدال سے بڑھی ہوئی مہمان نوازی کے مناظر آیندہ چل کر اور بہت سے دیکھنے میں آئے۔ پہلا منظر یہیں دیکھا۔ برادر نسبتی، معظم علی صاحب بیرسٹرایٹ لا (جو برادران کی قید کے زمانے میں خلافت کمیٹی کے سکرٹری رہے تھے، اور

اب ریاست رامپور میں چیف کورٹ کے چیف جج ہیں) اور دونوں داماد، زاہد علی اور محمود اللہ بھی ساتھ میں تھے۔ کلام جوہر کا دوسرا ایڈیشن اسی قید کے زمانہ میں جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس پر مقدمہ اسی نیاز مند کا تھا۔ اس تقریب کے اکثر شعر و شاعری کے چرچے رہا کرتے۔ کبھی اپنا کلام سناتے اور کبھی میں "تنہائی کی راتوں میں خلوت کی ملاقاتوں" کا حال جھگڑ جھگڑ کر پوچھا کرتا۔ مسجد بہت فاصلہ پر تھی۔ نمازیں گھر پر ہی مختصر جماعت کے ساتھ ہوا کرتیں۔ امامت بڑے ردّ و انکار کے بعد اپنے لئے منظور کی تھی۔ نماز پڑھنے میں دیر سویر کے تو کچھ ایسے پابند تھے۔ لیکن جب بھی پڑھتے۔ بہت دل لگا کر پڑھتے۔ بعض اوقات دیکھنے والے بھی خشوع و خضوع سے متاثر ہوتے۔

چند روز کے بعد واپسی کی ٹھہری۔ بیمار لڑکی کے پاس ماں کو چھوڑا۔ خود مع بڑی صاحبزادی اور اُن کے شوہر اور بچوں اور معظم صاحب کے روانہ ہوئے، اور سب لوگ رامپور جا رہے تھے۔ خود لکھنو آئے۔ بھوالی سے صبح ناشتہ کر کے لاری پر کاٹھ گودام اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئے۔ دوپہر کو اسٹیشن پہونچے۔ محمدؐ علی کے درشن یا زیارت کے لئے خلقت کا ٹھٹ لگ گیا۔ زیادہ تر ان پڑھ، جاہل، محض نظر عقیدت سے دیکھنے والے تھے۔ عین اُسوقت معلوم ہوا کہ لاری والا کرایہ بہت گران طلب کر رہا ہے۔ لاری طے زاہد صاحب نے کی تھی۔ بس وہیں مجمع عام میں مولانا کو اپنے جوان اور صاحب اولاد بھتیجے اور داماد پر غصہ آیا ہے اور اس طرح گرج گرج کر ڈانٹنا شروع کیا کہ یہ منظر خود ایک تماشہ بن گیا۔ جو آنکھیں شان جمالی بار ہا دیکھ چکی تھیں انھیں اسوقت شان جلالی کا نظارہ کرنا پڑا۔ کوئی اسے عیب سمجھے۔ میں تو اسے بھی محمدؐ علی کا ہنر ہی سمجھتا ہوں۔ کوئی بنا ہوا شخص ہوتا۔ تو یقیناً اس مجمع عام میں اپنے غصہ کو پی جاتا۔ پھر تنہائی میں جو کچھ جا ہتا کہہ گزرتا اور کر گزرتا۔ لیکن محمدؐ علی پر تصنع کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا زندگی کا ہر گوشہ آئینے کی طرح واضح شفاف اور روشن تھا کبھی اسکی فکر ہی نہ ہوئی کہ معتقدین کیا خیال کریں گے اور کتنوں کی عقیدتمندی کو ٹھیس لگ رہیگی۔ جو کچھ خیال میں آیا بے جھجک اور بے دھڑک کہہ گزرے جو کچھ سمجھ میں آ گیا بلا خیال

مخلوق کر گزرے، مخلوق سے ڈرنا اور جھجکنا شاید کبھی جانا ہی نہیں۔ رات ہو گئی تھی جب بریلی پہونچے۔ عشا کی نماز یہیں ہوئی۔ قاضی عبدالغفار بی اے یہیں ملنے آگئے تھے، اور حیات صاحب بھی یہیں سے شریک سفر ہوئے۔ داخلہ کونسل کا فتنہ پھیل چکا تھا۔ قاضی صاحب ہمدرد کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اور مولانا کے خاص مخلصین میں تھے۔ اسی کونسل کی ممبری کے مسئلہ پر دیر تک ان سے بحث مباحثہ رہا۔ کھانے کے لئے پلیٹ فارم پر وسیع بستر خوان بچھا۔ اور محمدؐ علی نے میرے ملازم کو بھی بہ اصرار کھانے میں شریک کیا، اور اپنے قریب ہی بٹھایا۔ امیرے لئے یہ منظر بھی نیا اور سبق آموز تھا۔ مخدوم و خادم، مالک اور خدمتگار، آقا و غلام کی مساوات سے متعلق کتابوں میں جو کچھ بھی پڑھا ہو۔ خلفائے راشدین کے کارنامے جو کچھ بھی سننے میں آئے ہوں، ان مادی آنکھوں سے، اس بیسویں صدی میں اور وہ بھی کسی زاہد خلوت نشین کے ہاں نہیں۔ وقت کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر کے ہاں، اس منظر کی توقع کس کو ہو سکتی تھی؟

لکھنؤ میں آپکی دعوتوں، ضیافتوں، اڈریسوں، کا سلسلہ تھا۔ کہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کو مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کی طرف سے "چائے" دیگئی اور ایڈریس پیش ہوا جلسہ کی صدارت اس نااہل کے حصہ میں آئی۔ محمدؐ علی کے سامنے بولنے کی ہمت کیا ہوتی۔ اور کہتا بھی تو آخر کیا کہتا، صدارت اس لئے بلا انکار قبول کر لی۔ کہ ایک اور موقع محمدؐ علی کے ساتھ انتساب کا ہاتھ آیا جا رہا تھا۔ تقریر صرف مولانا ہی کی ہوئی صدر تو گونگا تھا ہی۔ حاضرین بھی سب کے سب گم صم بنے رہے۔ معًا بعد میونسپل بورڈ کی طرف سے اڈریس پیش ہوا۔ بعد مغرب امین الدولہ پارک میں عظیم الشان پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ چودھری خلیق الزمان صاحب صدر تھے۔ بی اماں مرحومہ بھی غالبًا موجود تھیں۔ ہندو بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ لیکن مسلمان تو اتنی بڑی تعداد میں عرصہ ہی کے بعد جمع ہوئے تھے۔ سارے ملک میں شدھی اور سنگٹھن کی رگ پھڑک چکی تھی۔ خاص لکھنؤ اور نواح لکھنؤ میں بھی تلخ و ناگوار مقامی قضیئے پیش

آچکے تھے۔ ایک شریر شخص نے ہنڈبل تقسیم کرنے شروع کردیئے۔ کہ یہ محمدؐ علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علیگڑھ میں کہا ہے کہ ایک فاسق و فاجر مسلمان بھی گاندھی جی سے بہتر ہے۔ ایسا شخص بھلا کانگرس کا صدر کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اشتہار خاصا اشتعال انگیز تھا۔ کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کر کے سوال بھی کردیا۔ مولانا کی پر زور تقریر جاری تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے داخلہ کونسل کی حمایت و وکالت میں کوئی بیان دیا تھا اس بیان کی دھجیاں بکھیری جا رہی تھیں کہ اس شخص نے یہ سوال کر دیا۔ بہت سے دوست اور مخلصین کچھ پریشان سے ہوگئے۔ خود صدر صاحب نے سائل کو بیٹھ جانے اور خاموش ہو جانے کا حکم دیا لیکن جلسہ بھر میں ایک شخص ایسا بھی تھا۔ جو سوال سے مطلق پریشان نہ تھا۔ اور دل میں پورا اطمینان رکھے ہوئے تھا۔ یہ شخص خود محمد علی تھا! محمدؐ علی نے خود صدر کی ممانعت کو منع کر کے کہا کہ "میں ابھی جواب دیتا ہوں اور یہ کہہ کر فرمایا کہ :-

"علیگڈھ میں میں نے جو کچھ کہا ہے' اُسے یہاں اور ہر جگہ دوہرانے کو تیار ہوں۔ گاندھی جی اس وقت ملک کے لئے جو خدمات انجام دے رہے ہیں' اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو نہ صرف اپنے سے کہیں افضل۔ بلکہ اپنی والدہ ماجدہ بی اماں سے کہیں زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے کہیں بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں لیکن دوسری حیثیت اعتقاد کی ہے۔ اور میں عقیدۃً مسلمان ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدہ اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں۔ اور اس لحاظ سے۔ یعنی جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے۔ میں اکیلے گاندھی جی ہی نہیں۔ تمام ہندوؤں' تمام عیسائیوں تمام غیر مسلموں سے' ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان' ہر بدتر سے بدتر اور بدعمل سے بدعمل مسلمان کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جز و ایمان ہے

اگر آج خدانخواستہ میں اس کا قائل نہ رہوں تو پھر مسلمان رہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی! ورنہ میری یہ کوئی انوکھی بات ہے۔ جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، ہر مذہب والا اپنے اپنے عقائد کو اسی طرح افضل تسلیم کرتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالوی کا یہ خیال، ہندو مذہب کے عقائد کے باب میں نہیں؟

دشمن سناٹے میں آگئے۔ دوستوں کے چہرے چمک اٹھے۔ خوب تالیاں بجیں۔ جوش و خروش سے نعرے بلند ہوئے۔ یہ جرأت اللہ نے صرف محمد علی ہی کو دی تھی۔ کہ عین قرب کانگرس کے موقع پر صدر منتخب ہو کر اس صفائی، اس دلیری کے ساتھ ہزار ہا کے مجمع عام میں ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں، کے سامنے اپنے اسلام اور اپنی اسلام پرستی کا اعلان کیا! ان آنکھوں نے تو ایسے مسلمان بھی دیکھے ہیں۔ جنھوں نے کانگریس میں اپنی پوزیشن قائم رکھنے کے لئے بڑی بڑی مداہنت دینی گوارا کر لی ہے۔

ابکی لکھنؤ میں قیام کئی دن تک رہا۔ ایک روز صبح میں نے اپنی قیام گاہ پر ناشتہ کے لئے زحمت دی۔ جس وقت آئے ہیں۔ تو سب سے پہلے میرے اسی ملازم سے بھرے مجمع میں بڑھ کر بغلگیر ہوئے۔ جسے اپنے ساتھ بریلی اسٹیشن پر کھانا کھلایا تھا۔ اس وقت تک ندوہ کا کتبخانہ پڑوس میں تھا۔ مولانا عبدالرحمن، نگرامی ندوی مرحوم ایسے موقعوں کی تاک ہی میں رہتے تھے۔ ایک مختصر اور ہلکی سی دعوت، طلبۂ ندوی کی طرف سے کتبخانہ میں کر دی۔ دیر بہت ہو چکی تھی۔ پھر بھی مولانا کو دعوت قبول ہی کرنی پڑی۔ ادھر چا، نوشی ہو رہی تھی ادھر نگرامی مرحوم نے ایک مختصر تقریر اس مضمون کی کر دی کہ "سیاسی تقریریں تو اور موقعوں پر ہم بہت سی سن لیں گے۔ اس وقت تو ہم طلبہ ندوہ یہ چاہتے ہیں کہ تنہائی کی راتوں میں جو خلوت کی ملاقاتیں نصیب میں آئی ہیں۔ ہمکو ان سے مستفید فرمایا جائے" نگرامی مرحوم بڑے گہرے دیندار اور صالح

نوجوان تھے۔ مولانا ان کی تقریر سے متاثر و محظوظ ہوئے۔ لیکن جواب میں فرمایا کہ میرے عزیز بھائی، تم بھی ایک شاعر کی بات کا اعتبار کر بیٹھے۔؟ شاعر تو خدا معلوم اپنے خیالی دنیا میں کیا کچھ دیکھتا ہے۔ اور کیا کچھ کہہ سن ڈالتا ہے۔ اس کی شاعری کا ثبوت اس سے عملی دنیا میں طلب کرنا۔ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کرنا ہے" یہ کہہ کر اس فرمائش کو ٹال گئے۔ اس پر ایک کہنے والے نے وہیں کہا کہ خدا معلوم وہ شاعری بڑھی ہوئی تھی۔ جو آپ نے اپنی غزل میں کی تھی یا یہ جو آپ نے اپنے جواب میں رکھی"! —— خیر یہ تو لطائف تھے۔ باقی اصل حقیقت مجھ سے راز کے طور پر (اور یہ راز آج غالباً پہلی بار افشا ہو رہا ہے) وہیں بھوالی ہی کے قیام میں یہ ارشاد ہوئی تھی۔ کہ خواب میں تو باریں تو نصیب میں نہ آئیں، البتہ ایک بار بیجاپور جیل میں، دوپہر کے وقت نیم بیداری کی حالت میں۔ ایک ہلکا اور دھندلا سا پرتو جمال نظر آیا تھا! —— اللہ اکبر! جس جمال کی زیارت خواب میں بھی نظر آنا۔ بڑے بڑے خوش نصیب اپنی خوش نصیبی سمجھیں۔ اس کے دیدار سے بیداری میں مشرف ہونے کی خوش بختی کو کن لفظوں میں ظاہر کیا جائے۔

قیدی جب جیل سے چھوٹتے ہیں۔ تو سیدھے اپنے گھر جاتے ہیں۔ محمد علی کا گھر اب کہاں تھا؟ رامپور وطن تھا۔ وہاں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ انھیں کے مؤثر الفاظ میں ؎

گھر چھٹا یوں کے چھوڑنے والے
ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے!

بیمار لڑکی جب پہاڑ سے اتری، تو اسے لیکر علیگڈھ پہونچے۔ اور جامعہ ملیہ کے احاطہ میں ایک بنگلہ لیکر رہنے لگے۔ اس خانہ بدوشی میں بھی ان کا وطن تھا۔ اللہ کے گھر کی خدمت کا حوصلہ رکھنے والے کی ایک آزمائش یہ ہوئی کہ خود اپنے گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ رہائش کا ٹھکانہ بھی اب کہیں سے نہ تھا۔ نور نظر کی مہلک علالت سب پر مستزاد۔ بیچاری کو اتنی بھی مہلت نہیں کہ جی بھر کر تیمارداری کر سکیں۔ کہا کرتے تھے

کہ قومی مصائب نے ذاتی مصائب کو اس طرح نگل رکھا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ کے عصا نے ساحروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا۔ کانگرس کی صدارت سر پر آگئی۔ اور انھیں سر اٹھانے کی مہلت نہیں۔ دوسرے حضرات خطبہ صدارت ہفتوں پیشتر نہیں مہینوں پیشتر سے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ فرصت واطمینان کے ساتھ بار بار مسودہ تیار کرتے ہیں۔ کاٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ دوست احباب سے مشورہ لیتے جاتے ہیں۔ یہاں ان میں سے کوئی شے بھی نصیب نہ تھی۔ کانگرس کا اجلاس کوکناڈا میں تھا۔ علیگڈھ سے کوکناڈا کا راستہ چار پانچ دن کا تھا۔ ایڈرس کا مسودہ وسط دسمبر تک قطعاً تیار ہو جانا چاہئے تھا۔ کئی دن چھپنے میں لگتے۔ پھر اردو ہندی۔ بنگالی وغیرہ میں ترجمہ بھی ہونا تھا یہ پہلے ہفتہ دسمبر میں خدا خدا کرکے ایڈرس لکھنے بیٹھے۔ مجھے تار سے حکم ملا کہ ترجمے کے لئے فوراً آؤ، میں نے کچھ عذر ومعذرت کی۔ دوسرا تار ملا کہ کوئی حیلہ حوالہ نہ چلیگا۔ فوراً آؤ۔ میر محفوظ علی صاحب قبل سے آچکے ہیں۔ جوں توں ۱۴ ردسمبر کی شام کو عشا کے وقت پہونچا۔ میر صاحب کے لئے ایک خیمہ الگ لگا ہوا تھا۔ اسی میں جگہ ملی۔ یہ بدایون کے "ملا" صاحب بھی بڑے چھپے رستم ہیں۔ رات کو دبے پاؤں۔ چوروں کی طرح تہجد پڑھنے اٹھتے ہیں۔ اور وسط دسمبر کی شدید سردی میں دور جاکر وضو کرکے آتے۔ اپنی والی بڑی احتیاط اور ہوشیاری کرتے پھر بھی چوری کھل ہی جاتی ہے۔ میری نیند بھی کھٹکے کی ہے۔ آنکھ کھل جاتی اور لحاف کے اندر سے لیٹے لیٹے اس سفید ریش جوان ہمت کی اخفائے عبادت کے تماشے دیکھا کرتا۔

خطبۂ صدارت معلوم ہوا کہ ابھی صرف نصف ہوا کہ کوئی خطبہ صدارت اتنی پریشان خاطری اور ابتری کی حالت میں کاہے کو لکھا گیا ہوگا! صاف کرنے اور نظر ثانی کا ذکر نہیں۔ محض مسودہ ہی کی تکمیل مشکل نظر آرہی ہے۔ ایک سر وہزار سودا کی پرانی ضرب المثل حرف بحرف صادق آرہی تھی کہ بمبئی کی طرف کے ایک نوجوان زود نویس — پارسی مسٹر باٹرا انگریزی میں ایم۔ اے اس وقت مولانا کے گویا کاتب تھے

مولانا زبانی بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتے جاتے تھے اس کے بعد ہی مسودہ ٹائپ ہوتا
جاتا' اور ہر ورق کی چار چار کاپیاں ہو کر مختلف مترجمین کو ترجمہ کے لئے دیدی جاتیں
ایک کاتب کافی نہ ہوا' اور پہلے مسودہ' اور پھر ٹائپ کرنے میں بھی بڑی طوالت نظر آئی
اس لئے بعد کو صرف ٹائپ ہی رکھا گیا۔ ادھر مولانا بولتے جاتے تھے اور ادھر اُن کے
الفاظ ٹائپ ہوتے جاتے تھے۔ اور ٹائپ شدہ اوراق فوراً پریس بھیجے جانے لگے
انگریزی میں چھپا ہوا ایڈریس ۴۲ صفحہ کا ہے! اتنی ضخیم کتاب بھی' بہ طور خطبۂ صدارت
کبھی کیوں لکھی گئی ہوگی! کام کا عجب انداز تھا' کوئی اور ہوتا تو بدحواس ہو جاتا' ابھی
لب مرگ بیٹی کے بستر پر پاس سے اٹھکر آئے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں'
کہ ایڈریس بولنا شروع کر دیا۔ چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے سکرٹری
صاحب آ گئے'! اور اُن سے مفصل بحث ومباحثہ شروع ہو گیا۔ میری شامت کہ میں نے
ایک دن اقبال کی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا۔ اب یہ خود ایک مستقل موضوع بن گیا۔ مہمانوں
کی خاطر داریوں میں کوئی فرق کیسے پڑ جاتا۔ اور خیر یہ حوصلہ میزبانی' باہر کے مہمانوں تک
محدود رہتا۔ جب بھی غنیمت تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' کہ جامعہ کے استادوں
کو (جو اپنی اپنی مستقل قیام گاہیں رکھتے تھے) پکڑ پکڑ کر بلا رہے ہیں۔ اور زبردستی اپنے
ہمراہ دسترخوان پر بیٹھا رہے ہیں۔ خدا جانے دوسروں کو کھلانے پلانے کے لئے دل میں
اتنی وسعت کہاں سے آ گئی تھی! آدھی آدھی رات تک ایڈریس کا کام ہوتا رہا۔ جب جا کر
کس مشکل سے ۲۸ دسمبر کو ختم ہو پایا۔ مولانا آخری ٹرین سے روانہ ہوئے اور ایڈریس پھر بھی اس
وقت تک چھپ کر نہ تیار ہو سکا۔ بعد کو ایک خاص قاصد کے ہاتھ اُس کی کاپیاں روانہ
ہوئیں۔ کانگرس کا عام اجلاس ۲۶ کو ہونے والا تھا۔ اس لئے اتنا بھی موقع مل گیا۔
مولانا کو ۲۴ تک پہونچ جانا لازمی تھا۔ ترجمہ ہم لوگ اس برق رفتاری سے کیونکر کر سکتے
تھے۔ ترجمہ یوں بھی آسان نہ تھا۔ ایک ایک فقرہ خدا معلوم کتنی تلمیحات۔ کتنے کنایات
سے لبریز ہوتا تھا۔ اور پھر وقت کی تنگی نے تو اس وقت سب کے ہاتھ پیر پھلا رکھے تھے'
جامعہ کے چند ہونہار طلبہ میں ایڈریس کے مختلف اجزاء تقسیم کر دیئے گئے۔ اصل ترجمہ نفیس

بیچاروں نے کیا۔ ہم لوگ نظرثانی بھی جی کھولکر نہ کرسکے۔

سنہ ۲۴ء محمد علی کی زندگی میں "عام الحزن" بڑے سے بڑے صدمے شاید سی سال کے لئے اٹھ رہے تھے۔ مارچ میں جوان بیٹی نے داغ مفارقت دیا! ابھی رونے والے باپ کے آنسو بھی نہیں خشک ہونے پائے تھے کہ ترکوں کے الغائے خلافت کی خبر آگئی! اپنی برسوں کی محنت اور جان سوزی کا یہ نتیجہ دیکھ کر محمد علی کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی اُسے بس عالم الغیب ہی جان سکتا ہے۔ حیرت اسی پر ہے کہ دیوانگی کی نوبت کیوں نہ آگئی۔ اپریل میں مولانا شوکت علی سخت علیل ہوئے اور ہفتوں علیل رہے۔ درمیان میں مایوسی ہو ہوگئی۔ وسط نومبر میں بی اماں نے انتقال کیا۔ اسی طرح کے اور صدمات اور افکار سال بھر برابر پیش آتے رہے۔ اس سال لکھنؤ میں بھی دو تین بار تشریف آوری ہوئی۔ اور صدر کانگرس کی حیثیت سے ہر مرتبہ پذیرائی بھی خوب دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ میں ہر بار خبر پاکر دریاباد سے چل کر ملنے کے لئے آتا۔ عموماً دونوں بھائی ساتھ ہی آتے۔ قیام وہی حسب دستور محلسرائے فرنگی محل میں۔ ایک بار شاید آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ ہی میں رکھا گیا۔ ہندو لیڈر بکثرت آئے۔ سب کی دعوت، مولانا عبدالباریؒ فرنگی محلی کی طرف سے بڑی عالی حوصلگی کے ساتھ ہوئی۔ وسط سال میں بڑے گاؤں (ضلع بارہ بنکی) میں شیخ الطاف الرحمٰن صاحب قدوائی نے آموں کی دعوت برادران کی بڑی اوالعزمی سے کی؛ بزرگ خاندان شیخ نثارالرحمٰن مرحوم زندہ تھے۔ شرفائے اودھ کی روایات مہمانداری کو انھوں نے از سرِ نو زندہ کر دکھایا۔ میرا ہمراہ رہنا لازمی تھا۔ بڑے گاؤں سے قریب ہی موضع سولی ہے۔ جوان مرگ مرحوم ولایت علی بی اے، ایل ایل بی محمد علی کے عاشقوں میں سے تھے۔ اور ہمدرد میں "بمبوق" کے نام سے ظریفانہ مضامین کے مشہور مضمون نگار ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے، برادران سولی گئے۔ وہاں سے بانسہ درگاہ حضرت سید شاہ عبدالرزاقؒ پر حاضری دی۔ لکھنؤ اور نواح لکھنؤ میں، اس طرح کئی دن قیام رہا۔

صدر کانگرس کی زندگی بڑی مشغولیت کی زندگی ہوتی ہے۔ گاندھی جی ابھی تک جیل میں تھے اس لئے اور بھی سب کی نگاہوں کے مرکز و محور اور ملک کے سب سے بڑے لیڈر محمد علی ہی تھے۔ دورہ کرتے ابھی یہاں پہونچا ابھی وہاں کانگرس کی طرف سے صدر کو سال بھر کے لئے ایک پرائیوٹ سکرٹری مل جاتا ہے مولانا نے ایک رامپوری نوجوان کو اس کام پر رکھا تھا۔ پھر بھی ڈاک کا کام اتنا زائد تھا کہ نپٹائے نہ نپٹتا۔ ہندو مسلم فسادات کی وبا ملک میں پوری طرح پھوٹ چکی تھی، اور جیل جاتے وقت ملک کی جو فضا محمد علی چھوڑ گئے تھے اب اُس کے بالکل برعکس تھی۔ بات بات پر بدگمانی اور بےاعتمادی۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی چھوٹ کر آئے۔ اور آخر مئی میں ان کا مفصل بیان ہندو مسلم اتحاد پر ینگ انڈیا میں نکلا۔ سب کو اس کا شدید انتظار و اشتیاق تھا۔ مولانا اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ فرنگی محل میں مقیم، وہیں پرچہ منگا کر پڑھا۔ مگر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ تفصیل تو اب اتنے عرصہ کے بعد ذہن میں نہیں، اتنا یاد پڑتا ہے۔ کہ گاندھی جی کے بعد ہندو مشیروں اور مقربان خاص پر بہت بگڑے۔ قیام اب تک علیگڈھ میں جامعہ ملیہ میں تھا۔ اب دہلی منتقل ہوئے اور کامریڈ اور ہمدرد نکالنے کا قصد مصمم ہوا۔ فضا کی حالت دیکھ دیکھ کر سخت کڑھ رہے تھے۔ اخبارات دوبارہ نکالنے کا قصد اسی خیال سے کیا کہ ان کے ذریعہ سے فضا کو درست کریں گے۔ وسط سال کے بعد دہلی آئے۔ اور وہی مکان کرایہ پر لیا جس میں دس بارہ سال قبل رہا کرتے تھے۔ کوچہ چیلان کا اجڑا ہوا نشیمن مدت کے بعد پھر آباد ہوا۔ مکان تھا بہت بڑا اور وسیع۔ نیچے کے حصہ میں پریس کی مشین۔ کامریڈ اور ہمدرد دونوں کے پریس کا کاروبار (ورک منیجر، عملہ، کتابت، خزانچی، وغیرہ کے دفاتر، صیغہ ادارت کے کمرے۔ خود مولانا کا دفتر اور ڈرائینگ روم اسی طرف سے نیچے زنانہ مکان کا راستہ نیچے اور اوپر دونوں جگہ دو ایک وسیع فاصل کمرے، مولانا کے عزیزوں اور مہمانوں کے لئے۔ پھر بھی بعض اوقات اتنا ہجوم ہو جاتا۔ کہ مکان کی وسعت ناکافی ثابت ہوتی۔

اخبارات نکالتے وقت، تجارتی پہلو کہیں نام و نشان کو بھی پیش نظر نہ تھا۔ مقصد تمام تر اصلاحی تھا لیکن اسوقت اخبار نکالنا آسان نہ تھا۔ ۱۲ء اور ۲۴ء میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بارہ برس کے عرصہ میں دنیا کی دنیا بدل چکی تھی

نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

سب سے پہلی چیز مصارف کی زیادتی تھی۔ ہر شئے اُس وقت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گراں ہوگئی تھی۔ کاغذ کا نرخ، کاتبوں کی شرح اجرت، اسٹاف کی تنخواہ ہر شئے کا معیار بلند۔ پھر اسوقت محمدؐ علی پوری طرح جوان تھے، اور تندرست و تنومند اکیلے سارا کام کر ڈالتے تھے۔ اور ہر طرح کی محنت برداشت کر لینے کو تیار۔ اس وقت کچھ تو سن کھسک آیا تھا اور سن سے کہیں زیادہ پانچ چھ سال کی نظربندی اور اسیری، خانگی اور قومی صدمات قدم قدم پر مایوسیاں، اور پھر مرض ذیابیطس کی شکایت ان سب نے مل ملا کر وقت سے کہیں قبل بوڑھا کر دیا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ بعض قوےٰ کے لحاظ سے میں پینتالیس برس کے سن میں ساٹھ سال کا ہو چکا ہوں۔ انتشار و افتراق، بغاوت و سرکشی کی آگ آگے چل کر تو کہیں زائد تیز ہو گئی۔ پھیلنی اور بھڑکنی اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی۔ جنھیں ۱۲ء میں اس پر فخر تھا۔ کہ محمدؐ علی انھیں اپنا ماتحت سمجھ کر ادنی چاکروں کی طرح کام لیتے ہیں اور وہ اپنی اس چاکری کو دوستوں میں بیٹھ کر مزے لے لے کر فخریہ بیان کرتے تھے وہی ۲۴ء میں اب مدِّ مقابل کی حیثیت سے حریفانہ و مدعیانہ لب و لہجہ کے ساتھ گستاخانہ چشم و ابرو کے ساتھ پیش پیش تھے، پھر غلام حسین اور ان کے بعد ولایت علی (بمبوق) جو ایک زمانہ میں کامریڈ کے ایڈیٹر کے دست و بازو تھے۔ اس وقت تک دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ سابق کے کاروباری عقل کل، عبدالرحمن سندھی۔ روٹھ کر الگ ہو چکے تھے ہمدرد کے سابق منیجر اور "تجاہل عامیانہ" کے "حاجی صاحب" میر محفوظ علی صاحب گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ قاضی عبدالغفار بی اے کی زندگی نیا قالب بدل چکی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر خود مولانا محمد علی کی عدیم الفرصتی اور ہر کمی کی تلافی کچھ نہ کچھ ممکن تھی۔ لیکن اس کمی کی تلافی کسی

درجہ میں کسی طرح ممکن نہ تھی۔ لیڈری اور ایڈیٹری دونوں کا ساتھ بنھنا دشوار ہے ۱۲ء
میں "ایڈیٹر" محمد علی نے لیڈری حاصل کی ۲۱ء میں لیڈر محمد علی نے ایڈیٹری شروع
کرنی چاہی۔

غرض جہاں تک ظاہری مصلحت سنجیوں کا تعلق ہے۔ اس وقت محمد علی کے اخبار
نکالنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ لیکن اس جوش و خلوص کے پتلے کو ان ظاہری مصلحت شناسیوں
کی پرواہ تھی ہی کب ؟ وہاں تو ہر شئے مشنری اسپرٹ (تبلیغی روح کے ساتھ) ہوتی تھی
ہر نقل و حرکت میں ایک عبادت کا رنگ ہوتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ کوشش یہی تھی اس کے
نقش قدم پر چلنے کی جس نے کہا تھا۔ ان صلوٰتی ونسکی ومحیایٔ ومماتی للہ رب العالمین،
نفع و نقصان، سود و زیاں سے بالکل قطع نظر کر کے۔ اخبارات کی اسکیم طے پا گئی، اور مجھے
حکم ملا کہ وسط ستمبر تک ضرور دہلی پہونچ جاؤں، اور شروع اکتوبر میں پرچے اپنے سامنے
نکلوا کر وطن واپس ہوں ——— اب پہلا سوال سرمایہ کا پیدا ہوا۔ پریس کی
مشینیں پہلی کی موجود تھیں پھر بھی ابتدائی مصارف کے سوال کا حل کرنا کچھ آسان
نہ تھا۔ اکبرالہ آبادی کے الفاظ میں ؎

اٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یاد خدا کرینگے
معاً مگر یہ خیال آیا۔ ملی نہ روٹی تو کیا کرینگے

خدا معلوم محمد علی نے کن کن دوستوں سے۔ کن کن طریقوں سے جوڑ بٹور کر کچھ
روپیہ فراہم کیا۔ کراچی کے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کا نام اچھی طرح یاد ہے۔ اس
وقت مولانا کے خاص مخلصوں میں تھے۔ رقم شاید ہزار دو ہزار کی تھی۔ کچھ ایسی بڑی نہ تھی
پھر بھی بہت غنیمت ہے۔ کچھ دھندلا سا خیال بمبئی کے جوانمرگ سیٹھ عمر سوبانی کے نام
کا بھی آرہا ہے۔ بڑی توقعات مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم سے تھیں۔ وہ پوری نہ ہوئیں
علی برادران کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم بھی اکثر کاموں میں امداد دیتے
رہتے تھے، خیال نہیں آتا کہ اس میں شریک ہوئے یا نہیں۔

سرمایہ کے بعد دوسرا سوال اسٹاف کا تھا۔ خیال یہ تھا کہ پروپرائٹر کی جیب پر بار کتنا بھی پڑ جائے۔ لیکن اسٹاف بہتر سے بہتر منتخب ہو۔ کمریڈ کے لئے تو کہنا چاہئے۔ کہ آخر تک کوئی مددگار نہ ملا۔ جن لوگوں کی درخواستیں آتی تھیں۔ وہ مولانا کی نظر میں نہ جچتے اور جنھیں مولانا چاہتے، وہ خود نہ آسکے" مولانا کی نظر پنجاب کے ایک بیرسٹر پر تھی، جو لندن سے ایک اسلامی اخبار کی ایڈیٹری کر چکے تھے، مگر ان صاحب کی امداد اس سے آگے نہ بڑھی کہ کمریڈ کے لئے وقتاً" فوقتاً" مضامین بھیجدیا کرتے۔ صوبہ برار کے ایک بی اے ایل ایل بی کے مضامین مولانا نے بمبئی کرانیکل میں پڑھے، اور انھیں بہت پسند کیا۔ مدتوں ان صاحب کی آمد کا انتظار رہا ان سے مراسلت رہی۔ بالآخر نہ آئے۔ کچھ روز صوبہ کی کونسل کے ممبر ہوگئے۔ سب سے زیادہ انتظار شعیب صاحب کا رہا۔ غلام حسین مرحوم کے حادثہ وفات پر انھیں نے نیو ایرا کو سنبھالا تھا۔ گاندھی جی کی گرفتاری پر ینگ انڈیا چلا چکے تھے۔ ہر طرح کمریڈ کی اسٹنٹ ایڈیٹری کے اہل تھے۔ سب کوششیں ہوئیں۔ مگر ان کا دل نہ کھینچنا تھا نہ کھینچا۔ بمبئی سے ایک صاحب کی درخواست آئی۔ نہایت ہی نیازمندانہ و معتقدانہ۔ مولانا نے بادل ناخواستہ اُنھیں کو بلا یا۔ کچھ روز تو اپنی درخواست کے انداز تحریر کو انہوں نے بنا ہا۔ اُس کے بعد کمریڈ سے علیحدہ ہو کر مولانا کے شدید ترین دشمن ہو گئے۔ اور تکلیف پہونچانے میں حدود سے بالکل متجاوز ہو گئے۔ اب دوسرے عالم میں پہونچ چکے ہیں۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ ہمدرد کے لئے درخواستوں کی کمی نہ تھی مگر وہی دقت یہاں بھی آتی جنھیں ہمدرد چاہتا تھا وہ عنقا تھے اور جو آنا چاہتے تھے وہ ہمدرد کو ان کی میزبانی میں تامل تھا۔ مولانا کو اتنی بھی فرصت نہ تھی کہ فرداً فرداً ہر شخص کی طرف توجہ کر سکیں اس نیازمند سے جو جو خدمت اس سلسلہ میں بن پڑی، انجام دی گئی۔ جالب صاحب مرحوم سے میں نے زبانی گفتگو کی تھی۔ دہلوی مگر لکھنو کی کشش ایسی غالب تھی کہ ہمدم چھوڑ کر ہمدرد میں آنا گوارا نہ کیا۔ زمیندار کے سالک صاحب سے بھی مراسلت رہی۔ مگر بے نتیجہ۔ آخری قرعہ انتخاب ان چھ صاحبوں کے نام پڑا، فاروق صاحب دیوانہ علیگڈھ کے ایم اے، ریاضیات کے ماہر اور ڈاکٹر ضیاء الدین

کے شاگرد رشید ہمدرد کے دو دِل کے کارکردہ۔ تجاہلِ عامیانہ کے ہیرو، بہمہ صفت موصوف۔ احتشام الدین صاحب دہلوی، علیگڈھ کے ایم اے۔ عارف ہسوی صاحب قاری عباس حسین صاحب، جعفری صاحب (موجودہ ایڈیٹر ملت، اُسوقت محض ایک نوآموز نوعمر جامعی تھے) حسن ریاض صاحب (جو بعد کو ہمت کے ایڈیٹر ہوئے اُسوقت یہ بھی باوجود اپنا ایک ہفتہ وار نکال چکنے کے نوآموز ہی تھے) ان میں سے دو صاحبوں کا تقرر مولانا نے خود اپنی پسند سے فرمایا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی، اتنا بہتر اسٹاف کسی دوسرے اُردو اخبار کا نہ تھا۔ اسٹاف کے تقرر کے ساتھ ہی یہ بھی ٹھہری۔ کہ مختلف مقامات میں، وقائع نگار خصوصی مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ لکھنو، علیگڈھ، بمبئی، وغیرہ میں وقائع نگار مقرر ہوئے۔ اور بعض مشاہیر اہل قلم سے درخواست کی گئی۔ کہ خاص خاص اہم سیاسی ادبی وعلمی عنوانات پر وقتاً فوقتاً اپنے مقالات سے مشرف کرتے رہیں

مجھے حاضری کا حکم وسط ستمبر میں ملا تھا۔ پہونچا تو معلوم ہوا گاندھی جی آئے ہوئے ہیں۔ اور وہیں مولانا ہی کے مہمان ہیں۔ ڈرائنگ روم اب بھی وہی تھا جو ۱۲ء میں تھا وہ مخملی کوچ اور صوفے وغیرہ اٹھ گئے تھے۔ اب صرف زمین پر ایک موٹی سبز دری کا فرش تھا۔ اور آفس میں میز اور چند کرسیاں۔ گاندھی جی خود اسی کمرے میں تھے، اور پاس کے مہمانوں والے کمرے میں اُن کے اسٹاف کے لوگ مہادیو ڈیسائی وغیرہ مولانا نے مجھے بیچا کر اپنے ذاتی کمرے میں سُلایا۔ ہجوم کی کمی یوں ہی کب رہتی تھی۔ اور اب تو گاندھی جی کے سبب سے ایک میلہ سا لگا ہوا۔ دروازے پر کانگرس کے رضا کاروں کا پہرہ، مولانا ہر وقت مہمانداری میں مصروف اخبار سے متعلق بات چیت کا موقع کسے؟ مولانا کھانا عام طور سے وہی کھاتے تھے۔ جو خوشحال شریف مسلمانوں میں کھایا جاتا ہے۔ دسترخوان پر دو ایک قسم کے گوشت ضرور ہوتے تھے۔ ایکی یہ دیکھا کہ ہندو مہمانوں کی خاطر گوشت یکسر موقوف! دسترخوان پر صرف سبزی ہی سبزی! گاندھی جی کے معمولات تو سب سے الگ اور نرالے تھے۔ ان کی شرکت کھانے پر بھلا

کیوں کسی کو تکلیف ہوتی ۔ البتہ اُن کے رفقاء ڈیسائی وغیرہ مولانا کے دسترخوان پر ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہوتے۔ انھیں کی رعایت سے مولانا نے خود بھی گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ ایک آدھ وقت تک مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد مسلمان مہمانوں کی تو یہ حالت ہوتی کہ ادھر دسترخوان پر نظر پڑتی۔ اور ادھر طبیعت جھنجلا کر رہ جاتی۔ شاہد دل ہی دل میں گاندھی جی پر کوسنے بھی پڑ جاتے! میرے پہونچنے کے دو ہی تین روز بعد گاندھی جی نے ہندو مسلم ہنگاموں سے خصوصاً ہنگامہ کوہاٹ سے متاثر ہو کر۔ دفعتاً اپنا وہ مشہور ومعروف ۲۱ دن والا (برت) (روزہ) رکھ لیا۔ ہم سب لوگ سہ پہر کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ہاں جامعہ ملیہ کی ایک میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ بعد مغرب وہاں سے چل ہی رہے تھے۔ کہ ہمدرد پریس کے مینجر عبدالعلی خاں بھاگے ہوئے پہونچے اور چپکے سے مولانا کے کان میں یہ خبر پہونچائی! سب سناٹے میں رہ گئے۔ جلدی جلدی گھر واپس آئے۔ اُس وقت کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ گاندھی جی کی خاموشی کا دن تھا۔ اور گو دن ختم ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی خاموشی کے ۲۴ گھنٹے پورے نہیں ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے چار مختصر انگریزی تحریریں لکھ رکھی تھیں، ایک اپنی بیوی کے نام، ایک انگریزوں کے نام، ایک ہندوں مسلمانوں کے نام، ایک اپنے میزبان کے نام، گاندھی جی کمرے میں دیوار سے تکیہ لگائے ہوئے۔ چپ چاپ بیٹھے ہوئے۔ داہنی طرف حکیم اجمل خان مرحوم اور ڈاکٹر انصاری، بائیں طرف بانی کار (ایڈیٹر، ہندوستان ٹائمس) جارج جوزف (ایڈیٹر انڈپنڈنٹ") رنگا آئر (ممبر اسمبلی) سامنے خود مولانا، اور حسرت موہانی، آصف علی بیرسٹر وغیرہم۔ ہر شخص مغموم و متاثر۔ حکیم صاحب نے الگ کمرہ میں جا کر آصف علی صاحب سے اور مجھ سے۔ گاندھی جی کے بیانات کا ترجمہ سنا۔ اور سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ پھر وہیں واپس آکر انھوں نے اور ڈاکٹر صاحب نے اور آصف علی صاحب نے سب ہی نے اپنی اپنی کوشش گاندھی جی کو اس ارادہ سے باز رکھنے کی کی۔ وہاں تبدیلی کی گنجائش کہاں تھی۔ مگر سب سے زیادہ مضطرب و پریشان۔ حیران و صدمہ زدہ خود مولانا محمد علی تھے۔ پہلے روئے، اور پھر بگڑے۔ اس طرح لڑتے اور ڈانٹتے ہوئے۔ گاندھی جی

سے میں نے اس کے قبل انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیال بھی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ جو شخص اس قدر ادب کرتا تھا۔ وہ یوں چیخ چیخ کر بھی گفتگو کر سکتا ہے۔ کہتے تھے کہ ہم سے بغیر صلاح و مشورہ کے آپ نے اتنا اہم قدم اٹھا کیسے لیا۔ یہ ہمارے ساتھ صریح دغابازی ہوئی۔ اگر آپ اتنا سخت مجاہدہ نہ برداشت کر سکے، اور مر گئے تو ساری ہندو قوم الزام مسلمان میزبان کے سر رکھیگی۔ گاندھی جی کی خاموشی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ مسکرا مسکرا کر جواب دے رہے تھے۔ کہا کہ بہر حال اب تو میں خدا کے سامنے عہد کر چکا مولانا نے کہا کہ یہ عہد ہمارے مشورہ کے بغیر عہد ہی ہے کب تک؟ قسمیں بھی جو ایسی جلد بازی میں کھائی جاتی ہیں۔ خدا نے انھیں لغو قرار دیا ہے۔ اور اُن کی پابندی لازمی نہیں کہی ہے۔ یہ کہکر کلام مجید کی آیت سنائی (لایواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم الخ) بی اماں زندہ تھیں، مگر بستر علالت پر پڑی ہوئی۔ اُن کے پاس سے پیام بھجوایا۔ کہ تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو۔" گاندھی جی نے کہا کہ" اگر میں اپنی حقیقی والدہ کے حکم کی تعمیل اس باب میں کر سکتا، تو آپ کا بھی کہا ضرور مان لیتا" گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

مولانا" کم از کم شوکت کا تو انتظار آپ کو کر لینا تھا۔ آپ پبلک میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی کام بغیر ان کے مشورہ کے نہیں کرتے اور عمل یہ"!

مہاتما" شوکت یقیناً میری رائے سے متفق ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ سپاہی آدمی ہے"

مولانا" سپاہی ہیں! یوں کہئے کہ آپ کے خیال میں وہ آپ کے حلقہ بگوش غلام ہیں"

میں تو ایک بجے شام کو پڑھ کر سو رہا تھا مولانا ۲½ بجے پر سوئے! مولانا کی مصروفیت گاندھی جی کے آجانے سے یوں ہی کیا کم تھی۔ اب اس تازہ واقعہ سے کہیں زائد بڑھ گئی دن رات انھیں کی نگرانی اور دیکھ بھال۔ مولانا شوکت علی کو ٹیلیفون پر رات ہی میں بمبئی خبر پہونچا دی گئی تھی دوسرے تیسرے دن وہ آگئے۔ اخباری اسکیم سب چند روز کے لئے غت ربود۔ میرا قیام اب بیکار تھا۔ مولانا کو دن رات میں بات کرنے کی بھی فرصت

نہ تھی۔ دو چار روز کے انتظار کے بعد وطن واپس چلا آیا۔ اور یہیں سے جو جو خدمت ہمدرد کی بن پڑی کرتا رہا۔ مولانا نے چلتے وقت پوچھا کہ اب کب آؤ گے۔؟ میں نے عرض کیا کہ اب درمیان میں ہرگز نہیں آنے کا آپ کے ہاں تو روز ایک نہ ایک مشغلہ رہتا ہے۔ اب جب پرچے نکال لیں گے اور انھیں وہاں پڑھ لوں گا۔ جب ہی آؤں گا ۳۱ اکتوبر کو خدا خدا کر کے کامریڈ کا پہلا پرچہ نکلا۔ اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور آٹھ دن کے بعد ۸ نومبر کی شام کو ۹ کا پہلا پرچہ ہمدرد کا شائع ہوا۔ محمد علی کے نام کا سکہ اب بھی دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ۱۲سو پرچے خاص دہلی میں نکل گئے! اور مانگ برابر جاری رہی عین اسی زمانہ میں بی اماں کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کی۔ محمد علی غریب سے تو نہ جی بھر تیمارداری ہی بن پڑتی نہ اطمینان و یکسوئی کے ساتھ اخبارات پر توجہ ہو سکتی ہمدرد تو خیر جوں توں نکلے جاتا۔ اصلی مصیبت کامریڈ کی تھی۔ جہاں کوئی ہاتھ بٹانیوالا نہ تھا۔ وسط نومبر میں بی اماں رخصت ہوگئیں۔ اور دنیا ایسی متقی خاتون کے وجود سے محروم ہوگئی۔ جس کی نماز فجر، باوجود کثرت سفر، اور رات کی تقریروں اور جلسوں کے پچاس سال کی مدت سے کبھی قضا نہیں ہوئی تھی! اور جس نے حج کے موقع پر غلاف کعبہ کو پکڑ کر یہ دعا نہیں کی تھی کہ اس کی اولاد کو بڑی بڑی دنیوی عزتیں حاصل ہوں، بلکہ رب کعبہ سے یہ عرض کیا تھا کہ میری اولاد کو دین کا سچا خادم اور پختہ مسلمان بنا دے۔

پرچے نکلنے شروع ہوگئے اور مجھے متواتر حکمنامے فوراً دہلی پہونچنے کے مل رہے ہیں۔ ہوتے ہوتے دسمبر کی شروع کی تاریخیں آگئیں۔ جب میں دہلی پہنچ پایا۔ وسط دسمبر کا زمانہ ہے غالباً ۱۵ تاریخ ہے کامریڈ ۱۹ کو نکلتا ہے اور محمد علی کو بلگام کانگرس اور خلافت کانگرس کے سالانہ جلسوں کے لئے ۱۸ ہی کو روانہ ہو جانا ہے۔ اور ابھی کامریڈ کے لئے ایک سطر بھی نہیں تیار! ——— یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی مدیر کامریڈ کی مصروفیتوں کا روزانہ یہی نقشہ رہتا تھا ——— ۱۵ کا دن بھی ختم ہوگیا کیونکہ بڑ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے اور پریس کے منیجر اور ہیڈ پروف ریڈر دونوں بھناتے ہوئے

کہ اخبار کیسے نکل سکیگا۔ کمپوزیٹروں کو مفت کی تنخواہ مل رہی ہے اور عین وقت پر راتوں رات اُن سے کام لیکر خواہ مخواہ (اوورٹائیم) (زائد اجرت) دینی پڑتی ہے۔ شام ہوئی رات کے نو ساڑھے نو بجے جاڑوں کی رات معلوم ہوتا تھا آدھی رات ہوگئی۔ میں تو ادھر سونے لیٹا۔ ادھر دیکھا کہ بیمار و کمزور محمد علی خوب گرم اونی اور کوٹ پہن پہنا دفتر کے کمرے میں آبیٹھے اور سکرٹری کی پکار ہوئی۔ اب محمد علی تھے اور اس غریب سکرٹری کی جان!

مضامین بولنے شروع کئے۔ دس بجے گیارہ بجے، بارہ بجے بیچارہ کب تک جاگتا۔ کہیں اُونگھ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ لگی غضب کی ڈانٹ پڑنے کہ شرم نہیں آتی! مجھے دیکھو کہ میں بیمار ہوکر اس سن میں اتنی محنت کر رہا ہوں، تم تندرست اور نوجوان ہوکر چند گھنٹے بھی نہیں جاگ سکتے۔ چلو ہٹو میں خود اپنے ہاتھ سے لکھ لونگا۔ تمہاری مدد کا محتاج نہیں۔ اسٹاف کے ایک دوسرے صاحب از خود اٹھ کر آئے۔ اور انھوں نے کام پورا کیا صبح پانچ سوا پانچ بجے میری آنکھ کھلی نماز فجر میں ابھی دیر تھی، آسمان پر اندھیرا چھایا ہوا۔ مگر کمرڈ کا دفتر بجلی کے لیمپ سے روشن۔ اسوقت کیا دیکھتا ہوں کہ محمد علی صاحب آفس سے سونے کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ ایسے ناوقت آفس کی طرف سے کہاں معلوم ہوا؟ کہ ساری رات کام کرکے اب یہ اللہ کا بندہ اٹھا ہے! ــــ یہ بد پرہیزیاں اور بے اعتدالیاں اچھے تندرست جوانوں کی صحت غارت کر دینے کو کافی ہوسکتی تھیں، چہ جائیکہ ایک ادھیڑ سن کا ذیابیطس اور دوسری مزمن بیماریوں کا یہ مریض اور یہ کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں بیاں ہوا۔ ہر مہینے خدا معلوم کتنی راتیں اسی طرح بیداریوں کی نظر ہوا کرتیں۔

مہینہ کی سولھویں رات تو یوں گزری ہی تھی۔ سترھویں اور پھر اٹھارہویں رات بھی اسی طرح دن بکر گزری اٹھارہ کا دن گزر کر انیسویں رات تھی جب محمد علی بلگام کیلئے روانہ ہوئے آخری بار خود دیکھا کہتے تھے آخر وقت تک

نہ ختم کر سکے۔ موٹر پر دیکھتے ہوئے اسٹیشن پر گئے۔ ریل پر بیٹھے تو وہی دیکھتے ہوئے آخر جب ٹرین چل لی ہے۔ جب کہیں جاکر کام ختم ہو پایا! اور کا غذات چلتی ہوئی ٹرین سے واپس ملے ہیں۔ ! یہ تھی کامریڈ کے کام کی نوعیت! کامریڈ کا کام تھا اتنا کہ ایک اچھے قابل اور جید استعداد کے ایڈیٹر کا پورا وقت مانگ رہا تھا۔ ملک کی لیڈری، کانفرنسوں اور کانگرسوں کی صدارت جلسوں میں تقریریں، کمیٹیوں کی شرکت، الگ دہی ہمدرد تک کی چیف ایڈیٹری اس کے ساتھ مل کر چلنی دشوار تھی۔ جتنی ولایتی ڈاک آتی تھی بخصوصاً اسلامی ممالک اور اسلامی مسائل سے متعلق ہر ہفتہ ولایت سے جس کثرت سے پریس کٹنگز (مختلف اخبارات و رسائل کے تراشے) موصول ہوتے رہتے تھے محض ان کو پڑھنا اور ان میں سے کامریڈ کے لئے چھانٹ کر انتخاب کرنا۔ تنہا یہی ایک کام ایسا تھا۔ جو ہر ہفتے پورے دو ڈھائی دن کا وقت لیتا تھا پھر نوٹ لکھنا۔ مقالات تیار کرنا۔ مراسلہ نگاروں سے مراسلت کرنا آخری پروف دیکھنا۔ یہ سارا کام اتنے پھیلاوے کا تھا۔ کہ اگر محمد علی کے پاس دو اچھے قابل مددگار ہوتے۔ جب البتہ جاکر انجام پا سکتا تھا۔ پر یہ مسلمانوں کی قسمت میں کہاں تھا؟ محنت کا نمونہ ابھی آپ دیکھ چکے۔ اب مصارف کا اندازہ فرمائیے۔ ۱۹ر کا پرچہ تو جوں توں نکل گیا۔ اب ۲۶ر کا پرچہ نکلنا تھا۔ اس کے لئے غیر منقولات تو چھوڑ گئے تھے۔ کچھ جگہ مکتوب لندن سے بھر دی گئی اور کچھ مہاتما جی کے خطبہ صدارت سے، لیکن ایڈیٹوریل کی ایک سطر بھی موجود نہیں محمد علی کو بیلگام پہونچ کر بھلا کمیٹیوں وغیرہ سے مہلت ملنی کہاں ممکن تھی۔ پھر بھی اسے محمد علی کی کرامت کہئے یا اعجاز! کہ ۲۴ر کو عین ہنگاموں کے شباب میں سوا سات ساڑھے سات کالم کا مقالہ لکھ ڈالا۔ لیکن اب بھیجیں تو کیسے بھیجیں؟ کہاں بیلگام کہاں دلی؟ آپ حیرت سے سنیں گے۔ اور مشکل ہی سے یقین کریں گے کہ اتنا طویل و عریض مضمون کامریڈ کے مفلس و قلاش ایڈیٹر نے، سارے کا سارا تار پر اپنے پرچے کے لئے روانہ کیا۔ اس پر ستم یہ کہ دو ڈھائی کالم کے قریب مضمون ۲۴ر کو روانگی سے رہ گیا۔ وہ ۲۵ر کو روانہ ہوا۔ ۲۵ر کو بڑے دن کی تعطیل، تار گھر ڈاکخانہ۔ سب کہیں ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ر کو جتنا حصہ

روانہ ہوا اس کی فیس اکیسپرس تار کی شرح سے دوگنی دینی پڑی۔ ان شاہ خرچیوں کی ہمت اچھے اچھے زردار اور صاحب سرمایہ اخبار والے بھی نہ کرتے لیکن اس جوش و خلوص کے پتلے کو کام کی دھن میں۔ قومی و ملی خدمت کی خاطر، اپنے آرام کی اپنے وقت کی، اپنے پیسہ کی، اپنی عزت کی۔ اپنی صحت کی، پروا تھی ہی کب؟ قوم کا کام صرف اعتراض کرنا! صرف دلشکن نکتہ چینی کرنا تھا۔ بجز آس پاس رہنے والوں کے اور کسی کو اس کا کیا علم؟ کہ قوم وملت کا یہ مخلص خادم قوم وملت کے لئے کس کس طرح ہر روز اپنے جگر کو خون کرتا رہتا ہے۔

اگست ۲۵ء کا آخری ہفتہ تھا میں دفتر کامریڈ میں مقیم تھا۔ مولانا کو اپنے عزیز ترین محبوب ترین نواسہ عارف کی خطرناک علالت کی رامپور سے خبر ملی رامپور میں داخلہ ممنوع تھا۔ تڑپ کر رہ گئے۔ نواب رامپور بمبئی میں تھے۔ ان کی خدمت میں ایک طویل و موثر تار، اجازت داخلہ کے لئے لکھا۔ ابھی یہ تار بمبئی روانہ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ رامپور سے عارف کے انتقال کا تار آگیا۔ فوراً سب کام چھوڑ کر رامپور روانہ ہوئے۔ کہ اسٹیشن ہی پر بیٹھے بیٹھے، دفن سے قبل ایک بار لخت جگر کا دیدار کر لیں تھے پہونچے تو معلوم ہوا کہ تدفین ہو چکی! انا للہ۔ اسٹیشن ہی پر چند گھنٹہ ٹھہر اور رو دھو کر دہلی واپس آگئے۔ دوسرے دن پانی پت چلنے کی ٹھہری۔ ہندو مسلم فسادات کی ہوا چلی ہوئی تھی پانی پت میں یکم اگست کو قربانی گاؤ کے سلسلہ میں شدید ہنگامہ ہو چکا تھا۔ اور پانی پت کے مسلمان مصر تھے کہ مولانا اس معاملہ کو ہاتھ میں لیں۔ ایسے ایسے ہنگامے خدا معلوم کتنے مقامات پر ہو چکے تھے۔ اور روزانہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ آل انڈیا لیڈروں کو اتنی فرصت کہاں، کہ مختص المقام فساد و بلوے سے اتنی دلچسپی لیں۔ محمد علی کے ہاں مسلمانوں کا کوئی معاملہ چھوٹا معاملہ تھا ہی نہیں۔ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کو دنیا کے کسی گوشہ میں تکلیف پہونچے اور محمد علی اس کے لئے مضطر و مضطرب! پھر ہر ہر واقعہ کی تحقیق کا اہتمام اس پر مستزاد۔ جب تک خود روئیداد کے ایک ایک جزئیہ کی پوری تنقیح نہ کر لیں۔ اس موضوع

قلم اٹھانا حرام!

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے!

رات دن اگر ۲۴ ہر کے بجائے اڑتالیس گھنٹے کے ہو جاتے۔ جب بھی اتنی فرصت کہاں ہاتھ آسکتی تھی! مگر محمد علی کے ہاں مسلمان کی تکلیف کے آگے عقل مصلحت سنج کی یہ دوراندیشیاں کہاں؟ پانی پت چلنے کے لئے بیقرار۔ کمر ٹیڑا ایک ہفتہ کا یوں ہی پچھڑا ہوا تھا۔ یہ رامپور سے واپس آتے ہی دوسرے دن مجھے اپنے ہمراہ لے۔ معاشاف کے ایک صاحب کے۔ پانی پت روانہ ہو گئے۔ چلے تو جیب میں دام نہیں۔ پانی پت کچھ ایسا دور نہیں، کرایہ وہاں تک کے لئے بھی نہیں موجود مشکل سے تھرڈ کلاس کے ٹکٹ کے دام نکلے۔ ۷۔۸ کروڑ مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا لیڈر "جیتو کا لاکھوں روپیہ اڑا جانیوالا" لیڈر دوپہر کے وقت برسات کی گرمی میں۔ تیسرے درجہ کی ایک کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ کوئی دو گھنٹے میں پانی پت پہونچ گئے سٹیشن پر ایک معمولی سا تانگہ ملا۔ اسی پر تینوں آدمی سوار ہو کر چلے۔ بازاروں میں سے ہوتے ہوئے پہلے مزار حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ پر حاضر ہوئے۔ اور پھر مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی کے ہاں آکر ٹھیرے۔ عصر کے وقت سے مولاناؒ کا گشت پیدل شروع ہوا۔ مسلمانوں کا ایک جم غفیر ساتھ۔ ہندو بھی جابجا شریک۔ خاک چھانتے اور خاک پھانکتے پسینہ میں لت پت۔ آگے آگے مولانا، قصبہ کی تمام وہ کچی پکی سڑکیں۔ گلیاں پگڈنڈیاں دیکھ رہے ہیں جن کے متعلق نزاع ہو چکی تھی۔ یا آئندہ احتمال نزاع تھا۔ اور سوالات کی بھرمار کرتے جاتے ہیں۔ میں کب تک ساتھ دیتا۔ میل آدھ میل کا معاملہ ہوتا۔ تو نبھ بھی جاتا میں تو تھک کر راستہ سے کٹ گیا۔ مولانا گھنٹوں مسلسل اسی طرح گشت کرتے رہے۔ یہ تھا وہ ذیابیطس کا مریض جو ابھی چند ہی روز ہوئے صاحب فراش رہ چکا ہے۔ رات گئے واپس آئے تو ہندو اعیان قصبہ کا گروہ ساتھ تیج کے ڈائرکٹر دیش بندھو گپتا اور فلاں اور فلاں مولانا سب سے جرح کر رہے ہیں۔ یہاں بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ ادھر میزبان صاحب دعوت کے اہتمام میں مصروف۔ خدا خدا

کر کے کھانا ہوا۔ اب آپ کہتے ہونگے کہ ۱۱ بجے تو محمد علی غریب کو اس دن بھر کی دوڑ کے بعد لیٹنا نصیب ہوا ہوگا۔ جی یہ کہاں۔ لیٹ کر تو میں سویا۔ مولانا اسوقت کسی حاکم سے (شاید کوئی ڈپٹی صاحب تھے) اسی معاملہ پر بحث و گفتگو کے لئے پیدل روانہ ہوئے۔ کوئی ۱½ بجے مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ معلوم ہوا اب واپس تشریف لائے ہیں ۲½ بجے گاڑی دہلی کے لئے ملتی تھی۔ اس کے لئے اسٹیشن روانہ ہوگئے اور مجھے سوتا چھوڑ گئے کہ تکلیف نہ ہو۔ سبحان اللہ کمریڈ میں "پانی پت کی جنگ رابع" کے عنوان سے جو مسلسل و دلچسپ مضمون کئی نمبروں میں نکلا وہ اسی سفر کا ماحصل تھا۔ ادنی اور پیشہ ور اخبار نویسوں کو چھوڑئے۔ یہ ارشاد ہو کہ جواہر لال اور گاندھی جی تک ادنی اور جزئی معاملات کے لئے اتنی محنت شاقہ اتنا تعب برداشت کرتے ہیں ؟۔

ولایتی اخبارات تو چند ہی آتے ڈیلی ہیرلڈ آئرش انڈپنڈنٹ وغیرہ لیکن اسلامی ممالک و اسلامی مسائل سے متعلق تراشوں کا انبار ہر ہفتہ اتنا ہوتا کہ پھیلایا جاتا تو کئی کئی اخباروں کے لئے کافی ہوسکتا۔ یہ تراشے انتخاب کے بعد کمریڈ میں بالالتزام شائع ہوتے۔ قسطنطنیہ سے ایک مفصل مکتوب ٹرکی اور لندن سے ایک مکتوب لندن بھی ہر ہفتہ ہونے لگا۔ اور پھر جہاد ریف۔ مسائل مصر، سوڈان موصل، عراق، شام، مراکو، بغاوت کردستان وغیرہ سے متعلق پر مغز، شگفتہ، مفصل ومدلل، ایڈیٹوریل مقالات۔ ہر ہفتہ کا کمریڈ گویا اسلامیات کا ایک مختصر سا انسائکلو پیڈیا ہوتا۔ مرتد کے لئے سزائے قتل۔ فقہ حنفی کا ایک مسلم مسئلہ ہے۔ مارچ میں بعض قادیانی احمدی۔ کابل میں سنگسار کئے گئے اور ہندوستان کی فضا اس بحث سے گونج اٹھی۔ محمد علی کا خیال یہ تھا کہ قتل کی سزا شریعت نے نفس ارتداد کی نہیں رکھی ہے۔ ارتداد مع بغاوت کی رکھی ہے۔ علماء کی ساری جماعت دیوبند فرنگی محل۔ سب دوسری طرف تھے۔ محمد علی تن تنہا ضمناً بحث۔ مقام حدیث کی آگئی۔ یعنی شریعت میں احادیث کا کیا درجہ ہے کمریڈ نے اس پر اسقدر شستہ و مدلل بحث کی کہ میں پڑھ کر پھڑک اٹھا بے اختیار

ہو کر خط لکھا کہ جی میں آتا ہے۔ دلی فوراً پہونچوں۔ اور جن انگلیوں نے اتنا بہتر مضمون لکھا ہے۔ انھیں آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاؤں؟ دلی آنے کے لئے ہمیشہ اس طرح کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جایا کرتا۔ بپن چندر پال لالہ لاجپت رائے۔ پنڈت موتی لال، یہ ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈر تھے۔ کمریڈ نے ان میں سے ہر ایک کی اس اس طرح خبر لی۔ کہ انھیں غریبوں کا دل جانتا ہوگا۔ بغاوت اس وقت تک گاندھی جی کے مقابلہ میں بھی اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ بڑے بڑے ہندو لیڈروں میں سے اکثر۔ ہندو مہا سبھا کے ساتھ، کوئی دل سے اور کوئی زبان سے ادھر کسی نے مہاتما جی پر حملہ کیا۔ اُدھر محمد علی کا قلم پوری بے جگری سے لڑنے کو موجود! ہندو کہتے تھے کہ گاندھی جی علی برادران کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہیں۔ یہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ خود "مولانا" نے اپنے کو مسلمانوں میں بدنام کر کے جس طرح مدتوں مہاتما کی ذات میں فنا رکھا۔ اس کی نظیر ملنی آسان نہیں۔ اور تماشہ یہ کہ مذہبی عقائد تو خیر بڑی چیز ہیں۔ اصول اخلاق اور فلسفہ عمل تک میں محمد علی کبھی گاندھی جی کے معتقد نہ رہے۔ خود مجھ سے اس پر بارہا بحثیں اور گفتگوئیں رہیں۔ محض گاندھی جی کے خلوص نیت پر یقین اور سیاسی اصابت رائے پر اعتماد یہ سب کچھ اُن سے کراتا رہا۔ سیاسی مضامین۔ جو گورنمنٹ کے مقابلہ میں ہوتے یوں تو ایک سے ایک بڑھ کر نکلتے رہے۔ لیکن میرے مذاق کو سب سے زیادہ وہ پسند آیا۔ جو ۲۵ء کے آخری پرچہ میں" ایک غیر تقسیم شدہ مکتوب" کے عنوان سے ۱۰ کالموں میں نکلا ہے۔ یہ گویا ایک خط ہے جو ہندوستان کے ایک انگریز سیولین نے ولایت میں اپنے ایک دوست کے نام لکھا ہے۔ اور اس کے اندر بے تکلفانہ انداز میں وہ ساری چالیں اور ترکیبیں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ جن سے تحریک خلافت و ترک موالات کو توڑ توڑ کر رکھا گیا "خط" نہایت دلچسپ ہے اور ٹھیک اسی لب و لہجہ میں جو ایک انگریز سیولین کے خط کا ہوتا ہے۔ دسمبر کی آخری تاریخوں میں جب کانپور میں جلسۂ خلافت و کانگرس کے موقع پر ملاقات ہوئی تو میں نے بڑی ہی گرمجوشی سے داد دی، مولانا اسوقت تک کمریڈ کی طرف سے بالکل ہی بددل ہو چکے

تھے۔ پھر بھی (میں سمجھتا ہوں کہ شائد میرے ہی بار بار کے اصرار اور عرض معروض سے) اس کا دوسرا نمبر لکھنے پر مستعد ہو گئے، اور یہ پرچہ جب بند کیا ہے، تو کمتوب کا دوسرا نمبر نکالنے اسی آخری پرچہ میں جو مقالہ افتتاحیہ، کالم کا ہے وہ کسی سیاسی بحث پر نہیں، مولانا منورالدین دہلوی کی کتاب الحج والزیارۃ پر ریویو ہے جس کے ضمن میں خود فقہ اسلامی پر تبصرہ آگیا ہے۔ انگریزی پرچہ میں اس قسم کا مقالہ صرف محمد علی ہی کا قلم لکھ سکتا تھا۔

کامریڈ کی مالی حالت اچھی کبھی بھی نہ رہی۔ بس لشتم پشتم کسی طرح چلے گیا۔ ایک مہینہ میں اگر سو خریدار بڑھے، تو دوسرے مہینے میں سوا سو گھٹ گئے۔ لوگوں کو شکایتیں بھی عجب عجب پیدا ہوتی رہیں۔ کوئی صاحب کہتے کہ اب اس میں شکسپیر کے ڈراموں پر اُس طرح کی تنقیدیں نہیں نکلتیں، جیسے ۱۹۱۱ء میں جب کلکتہ سے کامریڈ نکلنا شروع ہوا ہے، ہوا کرتی تھیں! کوئی صاحب فرماتے "اب اس میں "گپ" کے کالم ویسے نہیں ہوتے جیسے اس کے دور اول میں ہوا کرتے تھے اصلی اور واقعی تکلیف کی بات خریداروں کے لئے یہ تھی، کہ پرچہ سے وقت کی پابندی نہ نبھ سکی۔ شروع میں چند ہفتے تو معاملہ غنیمت رہا۔ پھر ناغہ ہو کر دو دو نمبر ساتھ نکلنے شروع ہوئے، اور آخر میں تو اس کی نوبت آگئی کہ تین تین چار پرچے ایک ساتھ مہینہ مہینہ سوا سوا مہینہ کے ناغہ کے بعد نکلتے! بہتر سے بہتر پرچہ بھی اس حالت میں کیونکر چل سکتا تھا! مضامین کی پرکھ رکھنے والے خریدار تو واجبی ہی واجبی ہوتے ہیں۔ بڑا گروہ تو بس یہ دیکھتا رہتا ہے۔ کہ پرچہ کسی طرح اپنے وقت پر ہاتھ میں آجائے۔ کامریڈ کے قدردان اسے بھی گوارا کر لیتے۔ اور پرچہ جس طرح بھی اور جتنے ناغوں کے ساتھ بھی نکلتا۔ بہرحال نکلے تو جاتا۔ مشیت کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ بند کردینے کا ارادہ محمد علی نے بار بار کیا۔ لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی طرح بات ٹل گئی۔ زیادہ تر مولانا شوکت علی کے دم دلاسوں سے کبھی فرماتے میں ابھی شعیب کو سب ایڈیٹری کیلئے بلاتا ہوں، کبھی کہتے "اتنے خریدار بمبئی سے بھیجتا ہوں۔ ۱۹۲۵ء جوں توں ختم ہوا۔ فروری ۱۹۲۶ء

میں مولانا سخت علیل ہوئے جسم میں جا بجا پھوڑے نکل آئے۔ اور صاحب فراش ہو گئے۔ میں نے دہلی جاکر دیکھا تو اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ کمریڈ چار ہفتوں سے قرض چلا آرہا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ایک نمبر میں تو خیر کسی طرح نکال ہی دیا۔ اس کے بعد کا پرچہ نکلنا کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ پریس والوں کمپوزیٹروں وغیرہ کے مطالبات مدت کے چڑھے ہوئے۔ انھیں کا بے بیاق کرنا مشکل تھا نئے مصارف کی گنجائش کہاں سے نکلتی اس طرح کوئی ۱۵ مہینے کی آب و تاب کے بعد یہ آفتاب صحافت غروب ہوگیا۔ اور اب کی مرتبہ اس کی تدفین گورنمنٹ کے ہاتھوں نہیں، خود قوم کے ہاتھوں ہوئی۔ محمد علی کا اصلی جوہر انگریزی انشا پردازی تھا۔ ساتھ ہی قوت استدلال نہایت قوی۔ بیان کی دلآویزی زبان کی شگفتگی۔ دلائل کی قوت۔ بحث کی جامعیت، سب مل ملاکر عجب سماں پیدا کر دیتے جس دن کمریڈ بند ہوا ہے ارکانِ حکومت کے علاوہ خدا جانے کتنے ہم چشم لیڈروں نے بھی اطمینان کا سانس لیا ہو گا۔ کہ ایک بڑا کانٹا پہلو سے دُور ہوگیا ——— کمریڈ بند نہیں ہوا مظلوموں کا فریاد رس، مسلمانوں کا ترجمان۔ دنیا سے اٹھ گیا!

الا تقاتلون قوماً نکثوا ایمانہم وہموا باخراج الرسول وہم بدؤکم اول مرۃ اتخشونہم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین۔

(توبہ۔ ع ۳)

تم ان لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنھوں نے اپنے عہد و پیمان توڑ ڈالے اور جو رسول کے جلا وطن کرنے پر کمر باندھ بیٹھے۔ اور انھوں نے خود ہی پہلے تم سے چھیڑ کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ اللہ ہی زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ اگر تم ایمان والے ہو۔

دسمبر سنہ ۲۶ء تھا۔ ایک روز صبح کچھ دن چڑھے، مولانا کے کمرے میں یک بیک چلا گیا۔ دیکھا کلام مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ زیادہ زور سے نہیں۔ مگر اتنی آواز سے کہ قریب کے بیٹھے ہوئے لوگ سن سکیں۔ کمرے میں تنہائی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے قبلہ رخ انہماک کیساتھ پڑھ رہے تھے میں چپکے سے جاکر فرش پر بیٹھ گیا ایک مترجم حمائل سامنے کھلی ہوئی تھی اور سورہ توبہ

اس وقت زیر تلاوت تھی ؟ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ آیت آئی جو اوپر درج ہوئی۔ خضوع وخشوع کی کیفیت پہلے ہی سے نمایاں تھی۔ اس آیت پر پہونچ کر جوش سے جھومنے لگے آواز بلند سے بلند تر ہوگئی۔ آخری ٹکڑے۔ اتخشونہم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین، کو بھرائی ہوئی آواز سے بار بار پڑھنا شروع کر دیا۔ تکرار کرتے جاتے تھے۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ زبان سے صرف الفاظ قرآنی کی تلاوت ہو رہی ہے۔ لیکن زبان حال سے صاف ایک مستقل و بلیغ تفسیر ہو رہی تھی، گویا کہ یہ رہے تھے کہ ہم بھی کوئی مسلمان ہیں جو حکومت سے ڈر رہے ہیں۔ پولیس سے ڈر رہے ہیں۔ قید و بند سے ڈر رہے ہیں! مسلمان کے لئے یہ بھی کوئی چیزیں ڈرنے اور خوف کھانے کی ہیں! مسلمان کو ڈرنا تو صرف ایک اور اکیلے خالق ذوالجلال سے چاہیئے۔ نہ کہ اس کی مخلوق سے! اور مخلوق بھی کون اس کی باغی اس کی نافرمان، اس کی طاعت و اطاعت سے خارج!

یہ منظر اپنی نوعیت میں میرے لئے بالکل انوکھا تھا۔ یوں تو محمد علی ہر سچے مسلمان کی طرح، سارے قرآن کے عاشق تھے۔ لیکن جن آیات میں توحید الٰہی کا بیان ہے۔ یا جن میں تاکید جہاد ہے انھیں پڑھ کر اور سن کر تو وہ بیتاب ہی ہو جاتے تھے۔ قال سے گزر کر حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ دھڑا دھڑ آنسو بہانے لگتے ۔ ہاتھ پیر پٹختے اور جوش اور کیف سے گویا بالکل بیخود ہو جاتے۔

یہ تھا ۱۹۲۶ء میں انگریزی کے ہفتہ وار کامریڈ اور اردو کے روزنامہ ہمدرد کا ایڈیٹر۔ اور انڈین نیشنل کانگرس کا پریسیڈنٹ! بھلا اس صدی کے ایڈیٹروں اور ان سے بھی بڑھ کر، لیڈروں کو قرآن خوانی اور وہ بھی اس شغف و انہماک کے ساتھ قرآن خوانی سے کیا واسطہ؟ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قرآنیت اور یہ اسلامیت کامریڈ اور ہمدرد دونوں کے اوراق میں دستور صحافت کے خلاف آئین جرنلزم کے علی الرغم برابر جلوہ گر ہو ہو کر رہی۔ جوہر پھر اہل قلم کامریڈ میں قتل مرتد جیسے خالص مذہبی مسئلہ پر بالکل منقولی حیثیت سے تین تین نمبر اور ۳۲-۳۲ کالم لکھ ڈالے۔ اور اردو کی ایک ضخیم فقہی تالیف کتاب الحج والزیارۃ

پر تبصرہ کے لئے ایڈیٹوریل کے،، کالم وقف کر دیئے۔ کیا حق تھا کہ باوجود اپنی مسلّم و مشہور انگریزی انشا پردازی کے، باوجود اپنی شہرہ آفاق سیاست دانی کے بیسویں صدی میں انگریزی جرنیلزم کے جوہر دکھا سکے؟ دھارے کے رخ کے خلاف پیراک کی قسمت میں ہار کر اور تھک کر بالآخر ڈوبنا تھا۔ چنانچہ کمریڈ سوا سال کی زندگی پاکر آخری سانس لیکر رہا ہمدرد پر یہ قیامت آئی کہ بالالتزام روزانہ اور بلا ناغہ اس میں قرآنی "حکمت و موعظت" کے درس دیئے جانے لگے۔ دسمبر ۲۴ء میں جب میرا جانا دہلی ہوا تو بڑے گلے شکووں کے ساتھ یہ ارشاد ہوا کہ "تم نے آنے میں اتنی دیر کی تمہارے انتظار میں ہمدرد کا ایک خاص عنوان رکا رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز بلا ناغہ ہمدرد کے شروع میں کوئی آیت قرآنی مع اردو تشریح کے درج ہوا کرے کہ جس جس مسلمان کے ہاتھ میں ہمدرد جائے وہ کم از کم ایک آیت تو مع تشریح کے تلاوت کر لیا کرے۔ اور غیر مسلموں کے سامنے بھی قرآن اس صورت میں پہونچتا رہے۔ عنوان حکمت و موعظت رہیگا۔ کل سے اس کالم کو اپنے ہاتھ میں لو۔ تعمیل ارشاد کے سوا چارہ کیا تھا۔ ۱۰ر دسمبر سے یہ عنوان ہمدرد میں مستقل ہو گیا اور جب تک ہمدرد بند نہ ہو گیا۔ برابر ہر ہر پرچہ میں کوئی نہ کوئی آیت مع تشریح کے شائع ہوتی رہی۔ شروع شروع میں یہ خدمت اس نیازمند کے سپرد رہی اس کے بعد اسٹاف کے لوگ اس کام میں بھی منجھ گئے۔ اور خود ہی یہ خدمت انجام دینے لگے۔ اردو میں روزنامے ابتک بڑے بڑے مذہبی لوگ نکال چکے ہیں۔ خاص علماء کے بھی روزنامے کچھ دن نکلے اور بعض عالم آج بھی روزناموں کے ایڈیٹر ہیں۔ مذہبیت کی یہ نظیر جو ایک علیگڑھ کے نیچری اور آکسفورڈ کے گریجویٹ نے اپنے پرچہ میں قائم کی۔ نہ اس کے قبل کہیں دیکھنے میں آئی۔ نہ اس کے بعد۔

یہ میں محض نمونہ دکھا رہا ہوں۔ محمد علی کی مذہبیت کا اور تو اور خود اسٹاف کے "روشن خیال" ممبر اس غلبۂ دینداری سے چیخ اٹھے۔ سارے پرچے، اتوار کو ڈاکخانہ کی تعطیل کے باعث خود ہی چھٹی مناتے ہیں۔ یہاں یہ حکم تھا کہ تعطیل اتوار کو نہیں، مسلمانوں کے یوم تعطیل جمعہ کو ہوا کریگی۔ اس سے بارہا نقصانات محسوس ہوئے۔ منیجر صاحب اور ایڈیٹوریل

اسٹاف دونوں نے بار بار (اخباری زبان میں) صدائے احتجاج بلند کی" لیکن حکم اُل زہا اسٹاف کے سب سے مینر ممبر علیگڈھ کے تعلیم یافتہ اسی زمانہ میں مجھے ایک عنایت نامہ میں میرے بعض مضامین مندرجہ ہمدرد کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

براہ کرم منقولی رنگ میں اتنا غلو تو نہ کیجئے کہ اخبار صرف مسجدوں اور خانقاہوں میں پڑھنے کے قابل رہ جائے۔ یہی شکایت مجھے مولانا محمد علی صاحب کے مضامین سے بھی ہے۔

ہمدرد جب نکلنا شروع ہوا ہے سچ اسوقت تک نہیں نکلا تھا۔ اور جب تین مہینے کے بعد نکلنا شروع ہوا، جب بھی کئی شریک کار موجود تھے، مجھے بہت کم وقت دینا پڑتا تھا۔ ہمدرد کی خدمت کے سلسلے میں خالی تھا۔ لکھنو علیگڈھ وغیرہ متعدد مقامات کے لئے وقائع نگار میں نے ہی ٹھہرائے۔ متعدد اہل قلم سے مراسلت کرکے مضامین خاص حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خود بھی شروع شروع کثرت سے مضامین لکھکر دئیے، زیادہ تر فرضی ناموں سے اور کبھی کبھی اڈیٹوریل میں اکثر مقالات، اور کثرت نوٹ۔ کم ازکم ایک مرتبہ ایک ایسا بھی ہوا۔ کہ ایک اہم مضمون مولانا کے نام سے شائع ہوا لیکن وہ لکھا ہوا اول سے آخر تک ان کے اسی نیاز مند کا تھا۔ لکھنو کے پنڈت کشن پرشاد کول۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر لبرل پارٹی کے رکن رکین۔ سیاسیات اور مذہبیات دونوں میں ہمدرد سے بعد المشرقین رکھتے تھے۔ لیکن بہرحال تھے ایک سنجیدہ لکھنے والے۔ میری فرمائش پر ایک مفصل مضمون دو نمبروں میں ہندو مسلم اتحاد پر لکھا۔ اس پر مفصل اڈیٹوریل تبصرہ مجھی کو کرنا پڑا۔ اسٹاف میں اول اول سے سینئر فاروقی صاحب رہے۔ انھیں مولانا کی ادا شناسیوں میں ملکہ حاصل تھا۔ کچھ روز بعد یہ چلے گئے۔ اور اب افسری عارف جنا ہسوی کے حصہ میں آئی۔ یہ بھی مولانا کے مزاج شناس تھے۔ اور مئی ۲۶ء تک جب تک انکا تعلق ہمدرد سے رہا، انھوں نے کام کو۔ باوجود اپنے بعض سیاسی و مذہبی اختلافات کے، بہ حیثیت مجموعی خوب نبھایا۔ لیکن ساڑھے چار سال کی زندگی میں خدا معلوم کتنے نئے نئے لوگ اسٹاف

میں شامل ہوتے رہے سب نہ اس درجہ کے محتاط تھے۔ نہ اس درجہ کے مخلص۔ بعض
صاحبوں نے زبانی اور تحریری بڑے بڑے دعوے مولانا سے محبت کے کئے۔ تجربہ کے
بعد معلوم ہوا کہ جتنی محبت مولانا سے تھی۔ اُس سے کہیں زائد مولانا کے روپیہ سے تھی،
جامعہ کے متعدد ہونہار نوجوان آآکر شریک ہوئے۔ اور تجربہ و تربیت حاصل کرکر کے الگ
الگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ جعفری صاحب کے جوہر بعد کو چمکے۔ اسوقت
محض ایک نوعمر کارآموز کی حیثیت تھی۔ ایک بڑا کام اسٹاف والوں کی نگرانی تھی یعنی اس
امر کی دیکھ بھال کہ کوئی بات ہمدرد کے معیار سے فروتر۔ یا مولانا کے مسلک کے خلاف
پرچہ میں نکل جائے۔ مولانا کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمیشہ پرچے پر رہا۔ لیکن بجز ان
چند مضامین کے جو کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ وہ تحریر فرمادیا کرتے تھے، چار ساڑھے چار
سال کی طویل مدت میں نہ کبھی وہ ہمدرد کے لئے مضمون لکھ سکے اور نہ کبھی اس کے "ایڈٹ"
کرنے کی فرصت نکال سکے، صرف ہدایات دے دیتے تھے۔ کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔
شروع ہی کا زمانہ تھا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے سید سجاد حیدر صاحب تازہ سفر ترکی سے واپس
آئے تھے۔ علیگڑھ میں اپنے مشاہدات سفر بیان کئے۔ ہندوستان ٹائمس نے یہ تقریر
اپنی خاص رنگ آمیزی کے ساتھ شائع کی مولانا کے سید صاحب کے بڑے گہرے اور مخلصانہ قدیم تعلقات
تھے۔ میں خود اُن سے ہمدرد کے لئے مضامین خاص طلب کرچکا تھا ان کے اس بیانات
میں کوئی بات ایسی قابل گرفت تھی بھی نہیں۔ اسٹاف کے ایک ممبر کو بے محل جوش آگیا۔
اور ڈیڑھ کالم کا ایڈیٹوریل انھوں نے سید صاحب کے جواب میں چھاپ دیا۔ جس میں بار
بار اُن کے "وابستہ دولت برطانیہ" ہونے پر تعریض تھی۔ مضمون چھپا ہوا دیکھ کر مجھے سخت
ندامت ہوئی، مولانا کو بھی مضمون ناپسند ہوا بہرحال اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مجھے بخ
کا معذرت نامہ سید صاحب کو لکھنا پڑا۔

شروع سنہ ۲۶ء تھا۔ ہمدرد میں گاندھی جی کے خود نوشت تجربات
زندگی کا ترجمہ مسلسل ینگ انڈیا سے نکل رہا تھا۔ گاندھی جی نے ایک جگہ ذکر بچپن میں اپنے چھپکر

گوشت کھانے اور پھر اُسے چھوڑ دینے کا کیا ہے۔ ہمدرد کا کمسن مترجم جب اس مقام پر پہونچا تو قوسین کے اندر یہ عبارت بڑھادی کہ" غالباً اچھا پکا ہوا نہ تھا۔ ورنہ اس آسانی سے نہ چھوٹتا۔ ترجمہ چھپ گیا۔ ظاہر ہے کہ مترجم کی نیت کسی دلآزاری کی نہ تھی محض مزاح و تفنن مقصود تھا۔ لیکن بات تھی بے موقع اور جس فضا میں ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز ہندو مسلم فساد کا باعث بنجاتی تھی۔ یہ بے ضرر مزاح بھی بہت کچھ باعث ضرر بن سکتا ہے۔ مولانا کی نگاہ دوسرے تیسرے دن اس پرچہ پر پڑی۔ مترجم صاحب اُسی وقت بلائے گئے۔ اور مولانا نے غریب کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا۔ کہ بیچارے کے آنسو نکل آئے۔ ۲ر فروری کے پرچہ میں وہ مضمون شائع ہوا تھا۔ ۔ر فروری کے پرچہ میں ایڈیٹوریل میں طویل و مفصل معذرت نکلی —— یہ ایک نمونہ تھا۔ ہمدرد کے معیار صحافت کا بھلا اسکو ملک کی عام اخباری فضا سے کیا مناسبت تھی۔ یہاں تو تفنن و خوش طبعی کے معنی ہی دوسروں کی توہین۔ تحقیر دلشکنی و دلآزاری کے تھے۔ اور ظریفانہ کالم لازمی طور پر رکھے اسی غرض سے جانے لگے تھے کہ ہر قسم کی فحاشی بدتمیزی اور لغو نگاری ان کے اندر آکر جائز ہو جائے۔ ہمدرد غریب میں نہ "سنسنی خیز" سرخیاں کبھی دی گئیں نہ ایسی خبریں کبھی شائع ہونے پائیں۔ جو نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان نفسانی پیدا کریں۔ مالک ہمدرد کا حکم یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ معلومات شستہ سے شستہ انداز میں ناظرین تک پہونچائے جائیں۔ اور ایڈیٹوریل اسٹاف اپنی بساط بھر اس کی تعمیل کرتا رہتا۔ مولانا ظفر علیخان اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے پرچوں میں ان حضرات کے نام "حضرت ظفر الملت والدین" اور "سیف الملت والدین" چھپنے کا عام مذاق ہو گیا تھا۔ ہمدرد نے بھی ایکبار بھی اپنے ہاں " محمد الملت والدین" کی ترکیب جائز نہ رکھی اور نہ کبھی لفظ "حضرت" اپنے مالک کے لئے استعمال کیا۔ اور تو اور رئیس الاحرار کا لقب مولانا کے لئے عام ہو چکا تھا۔ سارے دوسرے اخبارات یہ بلا تکلف لکھ رہے تھے لیکن جس اخبار نے یہ بھی کبھی مولانا کے لئے نہ استعمال کیا وہ خود مولانا ہی کا ہمدرد تھا۔ مولانا کی تاکید تھی۔ کہ زیادہ تعظیمی الفاظ و القاب ہرگز ان کے لئے نہ استعمال نہ ہوں۔ بس زیادہ سے زیادہ لفظ "مولانا" کی اجازت تھی۔ ہمدرد خشک پرچہ ہرگز نہ تھا۔ اذیت

اس میں چٹخاری نمایاں رہتی تھی۔ افسانے اس نے بارہا شائع کئے ادبی تبصرے برابر نکلتے رہتے تھے۔ مہذب شوخی اس کے اڈیٹوریل میں وقتاً فوقتاً جھلکتی رہی "حاجی بغلول" صاحب بھی کبھی کبھی جلوہ فرمائی کرتے رہے۔ شعر و سخن کے چرچے بھی اس کے صفحات پر جاری تھے۔ بایں ہمہ مذاق عوام کی پیروی اس سے کبھی نہ ہوسکی۔ بازاریت اور ابتذال کی نقالی وہ نہ کرسکا۔ خشک وہ یقیناً نہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی چٹپٹا بھی نہ بن سکا۔ بگڑے ہوئے ذائقے جس چٹپٹے پن کی تلاش میں تھے۔ اس سے وہ ہمیشہ تہی دامن ہی رہا۔ اشتہارات تک میں اس نے احتیاط برتی۔ سینما، تھیٹر، شراب، فحش دواؤں، فحش کتابوں کے اشتہارات اس نے کسی اُجرت پر بھی نہ چھاپے۔ ۱۹۲۵ء کا شروع تھا کہ ایک بازاری عورت کے سلسلہ میں، بمبئی کا ایک لکھ پتی نوجوان مسلمان، مہاراجہ اندور کے اشارہ سے سربازار قتل ہوا۔ قتل کا ہونا تھا کہ گویا اخبارات کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ ایک دو دن نہیں ہفتوں تک بڑے بڑے معزز و خود دار اخبارات اسی قصہ سے رنگیں رہے۔ تصویریں، کارٹون، نظمیں، خبریں، افتتاحیے، سبھی کی بھرمار۔ ملک کے طول و عرض میں شاید صرف ہمدرد ہی ایسا تھا۔ جس کے کان پر کہنا چاہئے۔ کہ جوں تک نہ رینگی۔ محمد علی نے تجارت کی دوکان نہیں کھولی تھی۔ اصلاح و ہدایت و وعظ و تلقین کا ایک ممبر تلاش کیا تھا۔

معاصرین سے الجھنا ہمدرد نے کبھی اپنا شیوہ نہ رکھا۔ مولانا کی تاکید تو اس باب میں تھی ہی۔ شروع شروع میں جو سینئر اسٹاف بہم پہونچا۔ وہ بھی اس بازاریت سے بیزار رہی رہا۔ فاروقی صاحب اور ان کے بعد عارف صاحب دونوں اس مذاق سے بیگانہ تھے۔ بلکہ فاروقی صاحب تو دوسرے سرے پر پہونچ گئے تھے۔ یعنی بعض اوقات بالکل بلا ضرورت بھی بعض معاصرین کی تالیف قلوب کیا کرتے لیکن اس احتیاط کے باوجود ایسے ایسے خوش ظرف معاصرین بھی۔ خصوصاً خاک پاک پنجاب میں موجود رہے۔ جو خواہ مخواہ بھی ہمدرد سے الجھتے رہتے اور جب کبھی ہمدرد کو چھیڑتے تو مخاطب براہ راست مولانا محمد علیؒ ہی کو بناتے، حالانکہ یہ سب خوب جانتے تھے۔ کہ مولانا مضامین لکھنا الگ

رہا ہمدرد کو پوری پابندی کے ساتھ پڑھنے کی بھی مہلت نہیں رکھتے!

خیر معاصرین کی نیش زنی تک پھر غنیمت تھا۔ ہمدرد کو اصلی مقابلہ حکومت سے کرنا تھا۔ ہندوستان کی آزادی، اور ہندوستان سے بھی بڑھکر ممالک اسلامیہ کی آزادی محمدؐ علی کو عزیز تھی۔ ہمدرد اور کمریڈ دونوں کے اجرا سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کو اسی نقطہ پر لاکر متحد کریں۔ جزوی معاملات میں اختلافات اور اندرونی نزاعات، اس مقصد کے حق میں زہر تھے۔ اس لئے محمدؐ علی کی انتہائی کوشش ہوتی کہ ہمدرد کبھی بھی اپنی قوت مسلمانوں کے اندرونی باہمی اختلافات میں پڑنے اور ایک فریق بن جانے، میں منتشر نہ کرے۔ لیکن مشیت کا نوشتہ بہرحال پورا ہی ہوکر رہتا ہے۔ محمدؐ علی کو ہمدرد کے دوران زندگی میں خدا معلوم کتنی بار، اندرونی فتنوں کی طرف پورے زور و قوت کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا، اور ہمدرد کو قدرتاً اس میں پورا حصہ لینا پڑا۔ ان جنگوں کا ذکر اس ڈائری کے آیندہ نمبروں میں آئے گا۔ ان میں سے پہلی جنگ جو ۱۹۲۵ء کی دوسری ششماہی میں چھڑی۔ شاید محمدؐ علی کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ جنگ تھی، محمدؐ علی کی عمر لڑنے میں گزری۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ لڑائی کے شائق ہرگز نہ تھے۔ اور جنگ میں ابتداء کرنا کسی طرح نہیں چاہتے تھے۔ یہ ۱۹۲۵ء والی جنگ، ناگوار جنگوں میں ان کے لئے ناگوار ترین تھی۔ اس میں مقابلہ دشمنوں سے نہ تھا۔ دوستوں سے کرنا پڑا، جو دوست عزیزوں سے بڑھ کر عزیز تھے۔ اُن سے کرنا پڑا، اور مرید کو اپنے مرشد کے مقابلہ میں صف آرا ہونا پڑا،

مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور اپنے زمانہ کے مشاہیر میں تھے۔ ایک نامور عالم ایک مشہور شیخ طریقت۔ اور رسالہا سال سے پبلک میں شہرت، ان دونوں حیثیتوں سے بھی بڑھکر، بطور ایک قومی کارکن اور سیاسی لیڈر کے، کانگرس میں پیش پیش گاندھی جی کے ہر مشورہ میں شریک، تحریک خلافت کے علمبردار، انجمن خدام کعبہ کے بانیوں میں سے ایک وجیہ و شکیل صاحب نفوذ و اثر، ذاتی خوبیوں کو

شمار میں لائیے تو بڑے مہمان نواز اور بڑے فیاض، بڑے ذی مروت اور بڑے صاحب اخلاق، جود و کرم کے پتلے ہر شخص کے کام آنے والے۔ اللہ کا دیا تھا بھی بہت کچھ، "سخنے" اور "قدمے" کے علاوہ درمے، بھی سب کی مدد کے لئے تیار عقائد دہی جو عام طور پر مشائخ کے ہوتے ہیں۔ درگاہوں اور مزاروں پر حاضری کے پابند خود اپنے ہاں اعراس دھوم دھام سے کرنے والے۔ علی برادران کے بعض اعزہ شاید قبل ہی سے مرید تھے۔ خود علی برادران کے ساتھ خدام کعبہ وغیرہ ابتدائی تحریکات کے زمانہ میں خوب خلا ملا ہو چکا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مولویوں کی جماعت میں ایسا روشن خیال کون ملیگا۔ ان کا یہ قول تھا کہ نیچریوں اور انگریزی خوانوں میں اس جمعیت دینی کی مثال ملنی ناممکن۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے عاشق زار، وہ ان پر فریفتہ و گرویدہ، یہ انکے والہ و شیدا۔ نظربندی کا زمانہ وہی شروع شروع کا تھا۔ برادران ابھی لینسڈون ہی میں تھے۔ چھنڈواڑہ میں ابھی منتقل نہیں ہوئے تھے۔ ایک روز مولانا یک بیک بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ اپنا ایک خواب بیان کر کے فرمایا۔ کہ میرے مرید ہو جاؤ ورنہ معلوم نہیں کہاں جا پھنسو، برادران نے چپکے سے ہاتھ بڑھا دے، اور سلسلہ عالیہ قادریہ رزاقیہ میں داخل ہو گئے ——— یہ ڈائری محمد علی سے متعلق ہے مولانا سے متعلق نہیں۔ تاہم آگے جو کچھ آ رہا ہے اس کے سمجھنے کیلئے محمد علی کے مرشد سے اس حد تک تعارف ناگزیر تھا۔

اگست ۶۲۵ سنہ کا مہینہ ہے۔ وسط ماہ کی تاریخیں گزر چکی ہیں۔ محرم کا مہینہ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ مولانا عبدالباری مرحوم و مغفور آستانۂ اجمیر پر حاضری دیکر لکھنؤ واپس ہوتے ہیں۔ دہلی چند گھنٹوں کے لئے اترتے ہیں۔ مع دو رفقاء باختصاص کے محمد علی سے ملنے آتے ہیں۔ دوپہر کا وقت محمد علی کے یہاں تخلیہ کہاں لیکن آج خلاف معمول اتفاق سے تخلیہ ہے۔ کمرے میں کل پانچ آدمی، مولانا اُن کے دونوں رفیق، محمد علی اور پانچواں یہ ڈائری نویس۔ محرم کا زمانہ ابھی تازہ

گفتگو تعزیہ داری اور بدعات محرم پر چلی۔ مدیر سچ، میں اُسی زمانہ میں، بہ سلسلہ محرم بہت "نیکنام ہو چکا تھا" اور اس کی وہابیت" بعض حلقوں میں جن کا تعلق مولانا مرحوم سے کچھ دور کا نہ تھا۔ پوری طرح مسلّم ہو چکی تھی، محمد علی نے بھی اسوقت کچھ ایسی ہی باتیں شروع کر دیں، اور خود مولانا نے بھی ایک بڑی حد تک موافقت فرمائی۔ بات میں بات نکلتی آئی۔ ذکر شہادت حضرت عثمان غنیؓ کا چلا۔ مولانا، بہرحال ایک عالم اور مرشد تھے، سیرت عثمانی پر کئی منٹ تک ایک مفصل تقریر فرمائی۔ خلاصہ یہ تھا کہ "حضرتؓ کے مناقب وفضائل کا کیا پوچھنا، مجموعہ کمالات ہی تھے، جس کے دل میں عثمان رضہ کی محبت نہ ہو اُس کے ایمان میں خلل۔ لیکن مزاج میں حضرتؓ کے مروت بہت ہی زائد تھی۔ حضرت علیؓ وغیرہ کے سامنے اصلاح انتظامات کا وعدہ فرماتے۔ اُس پر دل سے عمل کرنا چاہتے مروان بیچ میں حائل ہو جاتا۔ اور بنتا ہوا کام بگاڑ دیتا۔ آپؓ سمجھتے سب کچھ تھے، لیکن بس وہی مروت کی زیادتی اس کی اجازت نہ دیتی کہ رخنہ اندازوں کو راہ سے دور فرما دیں۔" محمد علی، سکوت اور سکون کے ساتھ پوری تقریر سنتے رہے، جب ختم ہوئی تو زور سے بول اٹھے "حضرت وہی دور آج بھی قائم ہے، عثمان غنی رض کا حلم ومروت بھی آج موجود ہے اور اُس حلم ومروت سے فائدہ اٹھانے والے مروان بھی آج موجود ہیں۔" مولانا بھی بڑے ذہین وزیرک تھے، مرید کے اس فقرہ سے پورا لطف لیا۔ پہلے مسکرائے، اور پھر ہنسے اور دیر تک لطف لے لے کر ہنستے رہے۔

ہمدرد اواخر ۱۹۲۴ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شریف حسین کو سالہا سال تک دادِ شقاوت دینے کے بعد بالآخر تخت حجاز سے رخصت ہونا پڑا تھا۔ دنیائے اسلام اس کی اور اس کی اولاد کی مظالم اور غداریوں سے پکار پکار کر پناہ مانگ رہی تھی۔ ہزارہا بیگناہ مسلمانوں، حاجیوں اور حجازیوں کا خون اس کی گردن پر ثابت ہو چکا تھا۔ مظلوموں کے منہ سے بے اختیار ہو ہو کر اُس کے حق میں بددعائیں نکل رہی تھیں۔ بیواؤں کے سینوں سے گرم گرم آہیں بلند ہو ہو کر

اس کے مظالم پر فریاد کر رہی تھیں، اور یتیم بچے بلک بلک کر اس کی سنگدلی کا افسانہ سنا رہے تھے، دست قدرت نے آخر کار، والی نجد، سلطان عبد العزیز ابن سعود کو انتقام کے لئے اس پر مسلط کر دیا تھا۔ فتوحات سلطانی کی خبریں برابر آ رہی تھیں، اور مصر و شام ہند و عرب، سب کہیں کے مسلمانوں کے چہرے کھلے جا رہے تھے کہ آخر کار تو فریاد رس نے ہماری سنی، اور مظلوموں کی نصرت گھڑی آ پہونچی۔ شریف و خاندانِ شریف کی طرف سے مسلمانوں کے دل ایسے پکے ہوئے تھے کہ اسے نکالنے کے لئے کوئی بھی کھڑا ہو جاتا تو مسلمانوں کے دل اس کے ساتھ ہو جاتے۔ ادھر سونے پر سہاگہ سلطان نے بار بار یہ علانات کرنے اور یہ بیانات دینے شروع کر دیئے کہ میں حجاز پر کوئی اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں آ رہا ہوں۔ میں تو اس ارض پاک کو شریفوں کے پنجۂ ظلم و ستم سے نجات دلانے کو اٹھا ہوں، ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام، وہ جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں گے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اب سلطان کا گھر اور ہونا شروع ہوا۔ ساتھ ہی فتحمندیوں کی خبریں بھی روزانہ آنی شروع ہو گئیں۔ آج مکہ معظمہ پر قبضہ ہو گیا۔ کل طائف ہاتھ آ گیا۔ آج شریف علی جدہ میں محصور ہو گیا۔ کل اس کی فوج نے، علاج بالمثل کے اصول پر عمل کر کے خود اس سے غداری کر دی۔ ہر صبح یہی چرچے، ہر شام یہی خبریں ——————

لیکن شریف کے تعلقات آخر سرکار برطانیہ سے تو ہوا خواہی و وفاداری ہی کے تھے، اور پھر نجدی آخر نجدی تھا" بدلا ہوا شریف" اپنی پوری قوت کے ساتھ شریف کی حمایت و نصرت پر سرگرم ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، **اور لاہور اور علی پور، بمبئی اور پھلواری** ہندوستان کے شمال و جنوب شرق و غرب میں جہاں جہاں بھی خوش عقیدہ بزرگوں کی بستیاں تھیں۔ سب کہیں کے تار حرکت میں آ گئے اور جنہیں سب کا ایکا رہتا تو مضائقہ نہ تھا۔ ان سب کی کمک پر فرنگی محل کا زبردست مورچہ جو بہ یک وقت شریعت کا بھی ایک مرکز تھا، اور طریقت کا بھی اور سیاست کا بھی!

دنیائے اسلام کی سیاست، عالم اسلامی کی فلاح و بہبود دوسروں کے لئے مشغلۂ تفریح تھا۔ محمد علیؒ نے یہ سودا نقد جان دے کر خریدا تھا۔ اسی ایک غم میں کیا کچھ نہیں جھیلنا پڑا تھا۔ عزت گنوائی، دولت گنوائی، صحت گنوائی۔ برسوں نظربندی میں کاٹے۔ جیل خانے جانا پڑا۔ قید تنہائی اٹھائی۔ اللہ کے گھر کی حفاظت کی فکر کی۔ تو اپنا گھر چھوڑنا پڑا، رامپور کی خاک کے ذرہ ذرہ سے محمد علی کا دل اٹکا ہوا تھا۔ اسی سرزمین پر قدم رکھنا اب محمد علی کے لئے جرم قرار پا گیا۔ خدا معلوم کتنی راتیں جاگ جاگ کر کتنے دن بے چینی سے کاٹ کاٹ کر، ہفتوں نہیں مہینوں اور برسوں کے غور و فکر کے بعد محمد علی بالآخر اس نتیجہ تک پہونچے تھے کہ اصلاح حجاز مقصود ہے، تو آیندہ ہمیشہ کے لئے اس ارض پاک کو بادشاہ گردی سے نجات دلادی جائے۔ یہ سارے فتنے ملکیت اور بادشاہت کے ہیں۔ ثابت نہ ہونے پائے کہ آج شریف کا دور دورہ ہے تو ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کی کتابوں کے اوراق جلائے جارہے ہیں۔ کل نجدیوں کا تسلط ہوا۔ تو قبوں اور قبروں پر پھاوڑے چلنے لگے۔ پرسوں باگ حکومت یمن کے زیدیوں کے ہاتھ آئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کی بے توقیری شروع ہو گئی۔ بس ایک شرعی جمہوریت تمام مسلمانوں عالم کے صلاح و مشورے سے، ساری دنیائے اسلام کے مشورہ سے قائم ہو جائے اور روز روز کا یہ جھگڑا مٹے۔ سیاسی قوت بھی جبھی ممکن ہے۔ جب یہ مرکزیت حاصل ہو رہے، آج کسی کی نظر میں حکومت حجاز کی وقعت ہی کیا ہے۔ غریب سلطنت اتنی بڑی بھی تو نہیں جتنی (حیدرآباد کو چھوڑیے) میسور وغیرہ کی ریاستیں ہیں۔ فرنگی سمجھتا ہے کہ جب جی چاہیگا۔ چٹکی سے مسل کے رکھ دونگا۔ عالم اسلام کی جمہوریت قائم ہو جائے تو کسی کو آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑے۔ اور شیر برطانیہ ہو یا عقاب جرمنی سب سمجھ لیں کہ اب مقابلہ تنہا حجاز سے نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ایک ہی وقت میں مصر سے یمن سے عراق سے شام سے حبشہ سے البانیہ سے افغانستان سے جاوا سے بلوچستان سے، بخارا سے، ترکستان سے، ٹرکی سے۔ ہندوستان سے سمالی لینڈ سے ایران سے۔ سب سے، اور سب کہیں کرنا ہے ______

محمد علیؒ مسلمانان ہند کے لیڈر، مشرق کے زعیم، کی آنکھ سوتے اور جاگتے برسوں یہ خواب شیریں دیکھتی رہی۔ رات کی نیندیں اور دن کی بیداریاں مدتوں اس آرزو کی پرورش پر قربان ہوتی رہیں۔ زبان اسی کی دعائیں کرتے کرتے تھک چلی۔ سلطان نجد کے اعلانات سے پہلی بار خواب کی تعبیر پوری ہوتی نظر آئی۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ اور ابھی نہال، ترکوں کے الغائے خلافت کا گہرا زخم دل پر ابھی تازہ تھا۔ جوان اور لاڈلی بیٹی کا داغ، جگر پر تازہ تر تھا۔ محمد علی کو معلوم ایسا ہوا۔ کہ غیب سے نزول مرہم کا سامان ہونے لگا۔ خلافت کمیٹی کے طرف سے شام میں وفد حجاز بھجوایا۔ اُس کے ذریعہ سے زبانی پیام سلطان کے پاس کہلایا خلافت کمیٹی میں بار بار رزولیوشن پاس کرائے الگ سے سلطان کے پاس تار بھیجے خط بھیجے، ہرتان اسی "شرعی جمہوریت" پر آکر ٹوٹتی۔ خود سلطان نے اپنی تقریروں میں، اعلانات میں، خطوط میں، ایک بار نہیں بار بار اور ڈھکے منہ سے لفظوں میں نہیں، ہانک پکار کر، وعدہ کیا کہ مجھے ملک گیری کی ہوس نہیں، میں حجاز پر حکومت اپنی نہیں، شریعت مطہرہ کی قائم کرانا چاہتا ہوں، ظالموں کے وجود سے اس خطہ پاک کو پاک کرنے کو اٹھا ہوں، آئندہ حکومت کے لئے خود مسلمان جسے چاہیں منتخب کریں۔

محمد علیؒ کی ان بلند خیالیوں تک کس کا دماغ پہونچتا۔ ان دوراندیشیوں اور مصلحت شناسیوں کو کون سمجھتا۔ اور کون ان کی قدر کرتا۔ کس نے ان مسائل پر اتنی دماغ سوزی کی تھی؟ کون ان مسائل کے پیچھے اس طرح خون جگر کھا کھا کر رہا تھا؟ اُدھر سلطان نجد کی پیشقدمیوں اور فتحمندیوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ کہ ادھر شامت کے مارے ہندی مسلمانوں میں دو اکھاڑے قائم ہوگئے۔ اور سب وشتم سے گزر کر نوبت "رفع یدین" تک آگئی ایک صف میں سلطان کے دوست تھے۔ مگر نادان، دوسرے اکھاڑے میں سلطان کے دشمن تھے۔ مگر وہ بھی دانا نہیں۔ دوستوں کی طرح نادان۔ اصل مسئلہ کو بھول بھال، اور اصلی تنقیح کو چھوڑ چھاڑ۔ بحث عقائد کی شروع ہوگئی اور "بدعت" و "توہب"

کا وہ زبردست دیو، جو سویا کبھی بھی نہ تھا۔ درمیان میں ذرا اونگھنے لگا تھا۔ پوری قوت کے ساتھ بیدار ہوکر۔ ہر طرف دوڑنے دھوپنے، چیخنے چنگھاڑنے لگا، ادھر سعودی نے خوش ہو ہو کر نعرے لگائے۔ کہ اب کیا ہے، پالا مار لیا ہے۔ یہ کمبخت بدعتی اور گور پرست اب تو آخر نیچا دیکھ کر رہے۔ ادھر شریفیوں کے ہاں شور ماتم و واویلا بلند ہوا کہ ہائے یہ کیا غضب ہوا جارہا ہے۔ ان ناشدنی وہابیوں کا بھی یہ منہ اور یہ حوصلہ ہوا۔ کہ مکہ اور مدینہ پر اپنا علم نصب کرنے لگیں! مشائخ اور پیرزادے، درگاہوں کے سجادہ نشین اور مزارات کے مجاور سب کھڑبڑ کے اُٹھ بیٹھے۔ کہ یہ ہمارا دشمن ازلی کہاں سے نکل پڑا، شریف آلِ رسول تھا۔ یہ اُس کے مقابلہ میں آیا ہے۔ یہ مردود ہے وہابی ہے جہنم کا کندہ ہے۔ کانا دجال ہے۔ شیطان ہے۔ یہ اگر جیتا۔ تو ہم کو نہیں جیتا چھوڑنے کا۔!

مولانا عبدالباری لکھنؤ میں۔ محمد علی دہلی میں، دونوں کی ٹکٹکی برابر مطلع حجاز پر لگی ہوئی ہے۔ ایک کی نگاہ میں مقابر سلمین کا احترام۔ دوسرے کے پیش نظر مصالح عالم اسلام! مقصود دونوں کا خدمت اسلام لیکن اپنی اپنی بصیرت اور اپنا اپنا مقام اجتہاد میں غلطیاں بڑے بڑے کاملین سے ہوئی ہیں۔ پہلی صدی کے اکابر سے ہوئی ہیں۔ تو چودھویں صدی کے علماء و مشائخ بیچاروں پر گرفت کیوں کیجیے۔ اور انھیں طعن و اعتراض کا ہدف کیوں بنائے رکھئے۔ اُدھر مولانا کی سمجھ میں یہ نہ آتا۔ کہ محمد علی خوش عقیدہ صوفی اور حنفی ہوکر وہابیہ اور نجدیہ کی حمایت کیسے کرنے لگا اور غیر مقلدین کا شریک حال کیونکر بن گیا۔ ادھر محمد علی کی عقل یہ سمجھنے سے قاصر، کہ مولانا انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار۔ اور مرکز اسلام کی آزادی کے لئے اس قدر بیقرار ہوکر، کس طرح اس فریق کے شریک کار ہوتے جارہے ہیں۔ جو انگریزی حکومت کو ارض پاک میں مداخلت کی دعوت دے رہا ہے، آپس میں بڑی مفصل اور موثر مراسلت ہوئی۔ پھر وسط اگست میں مولانا لکھنؤ سے اجمیر جاتے ہوئے دہلی میں اترے۔ اور

محمد علی سے مل کر گھنٹوں زبانی گفتگو کی۔ لیکن جو مشیت میں ہوتا ہے۔ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔ غلط فہمیاں بجائے گھٹنے کے بڑھتی ہی گئیں۔ اگر ایک غلط فہمی دور ہوتی تھی۔ تو اس کی جگہ دو اور پیدا ہو جاتی تھیں۔ اور جو دل جڑے ہوئے تھے۔ ان میں روز بروز دراڑیں ہی پڑتی چلی گئیں۔ درمیانی لوگ طرح طرح کی دراندازیوں میں مصروف۔ مولانا نے کہا کہ مصالحت یوں ہو سکتی ہے کہ سلطان انہدام مساجد پر اظہار ملامت کریں۔ تیز جو قبے اتار ے گئے ہیں انھیں اپنے صرفہ سے از سرنو تعمیر کرا دیں۔ یا کم از کم دوسروں کو اس کی اجازت دیں۔ محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ خیر ان مطالبات کے پیش کر دینے میں مضائقہ نہیں لیکن ہے یہ مسئلہ عالم اسلام کی کانفرنس ہی کے طے کرنیکا۔ جس میں ہر فرقے کے علماء شریک ہونگے مولانا کے یہ مطالبات اخبارات میں نکلے۔ لیکن لکھنے والے نے تمہید میں یہ لکھدیا کہ مولانا محمد علی کو بھی اس رائے سے اتفاق ہے۔ یہ تحریر اور تو اور ہمدرد میں نکل گئی۔ محمد علی نے اپنے "اتفاق رائے" کو جب پڑھا۔ تو بہت تکلیف محسوس کی۔ دوسرے ہی دن اپنے نام کے ساتھ مفصل تردید اتنے ہی جزو کی ہمدرد میں چھپوائی یہ مضمون چھپا محمد علی کے نام کے ساتھ ہے لیکن ان کے حسب ارشاد لکھا ہوا۔ ان کے اسی نیازمند کا تھا۔ صرف چند الفاظ اور فقرے ان کے قلم کے بڑھائے ہوئے تھے۔ خیر یہ سب تو تھا ہی۔ کہ یک بیک ۲۳ اگست کو لندن سے چلا ہوا۔ وہ مشہور و معروف تار آگیا۔ جس میں مسجد نبوی پر نجدیوں کی گولہ باری کی خبر تھی۔ اس تار کا شائع ہونا تھا، کہ گویا سرزمین ہند میں ایک بھونچال آگیا۔ آگ پر مٹی کا تیل پڑ گیا۔ اور شعلے لپک لپک کر آسمان تک پہونچنے لگے۔

۲۳ر اگست ۱۹۲۵ء میں دہلی میں ہوں رلیف اور حجاز دونوں جگہ کی خبریں روزانہ جاذب توجہ بنی ہوئی ہیں۔ مولانا اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ بی کے چھوٹے بچے عارف کی وفات کی خبر پاکر، مع بیگم صاحبہ رامپور گئے ہوئے ہیں۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ رامپور کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت ہی کہاں تھی۔ صرف رامپور اسٹیشن

گئے ہوئے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے میں کھانا کھا رہا ہوں کہ عارف ہسوی صاحب ہمدرد کے ذمہ دار ایڈیٹر کمرہ میں آتے ہیں۔ اور حسرت و یاس کے ساتھ ہانپتے کانپتے ہیں کہ بخدی آخرابنی ہٹ کر کے رہے، مدینہ پر گولہ باری کی خبر آگئی ہے ہم یہاں ان کی بات بتاتے رہے۔ اور وہ ظالم آخر اپنی والی حرکتیں کر گزرے! میں حیران و ششدر، "منہ کا نوالہ منہ میں، اور ہاتھ کا ہاتھ ہی میں۔ عارف صاحب کا منہ دیکھنے لگتا ہوں " کیا واقعی خبر آگئی؟" عارف صاحب جل کر جواب دیتے ہیں " ہاں ہاں صاحب کہہ تو رہا ہوں، رائٹر کا تار ہے۔ صاف صاف بمبارڈمنٹ کی اطلاع ہے۔ جھٹ پٹ ہاتھ دھو دھلا، عارف صاحب کے ساتھ ہی اُس کمرہ میں آتا ہوں، جہاں ہمدرد کا ایڈیٹوریل اسٹاف کام کر رہا تھا۔ اور جی ہی جی میں دعا کرتا آیا، کہ خدا کرے خبر جھوٹ ہو۔ عارف صاحب انگریزی جانتے نہیں۔ خدا کرے یہی تار کا مطلب غلط سمجھے ہوں۔ دفتر میں تار میز پر رکھا ہوا تھا۔ خود پڑھا۔ اور دل جس چیز کو ماننا کسی طرح نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ماننا پڑا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس تار کو کیا جائے؟ کسی نے کہا کہ اسے شائع ہی نہ کیا جائے دوسروں نے کہا کہ اس سے نتیجہ؟ تار رائٹر کا ہے۔ بہر حال انگریزی اُردو کے سب ہی اخبارات میں پہنچا ہو گا۔ اکیلے ہمدرد کے نہ چھاپنے سے خبر تو چھپنے سے رہی۔ پھر ہمدرد اپنے سر ایک اخفاء خبر کا مزید جرم کیوں لے؟ ـــــ مولانا موجود نہیں، ہدایت و رہنمائی کس سے حاصل کی جائے! حیص بیص، قیل و قال! ـــــ بالآخر طے یہ پایا۔ کہ تار اخبار میں دے تو بہر حال دیا جائے۔ لیکن نمایاں نہ کیا جائے۔ بلکہ عنوان ایسا دیا جائے جس سے خبر کی "اصلیت" پوری طرح ظاہر ہو جائے۔ یعنی "حملہ مدینہ منورہ کے متعلق انگریزی بیان" (تار لندن سے آیا ہوا تھا۔ اس لئے یہ عنوان بالکل مطابق واقعہ تھا) اور تار کے ترجمہ کے ساتھ یہ نوٹ بڑھا دیا جائے کہ مسلمان ابھی اس خبر کی تصدیق کا انتظار کریں فوراً اشتعال نہ قبول کر لیں۔ ڈاکٹر سید احمد تاروں کے مترجم تھے، انھیں نے یہ سب کچھ کیا۔

---

۲۴ راگست ۱۹۲۵ء ۔ مولانا شب کی ٹرین سے واپس آ گئے۔ صبح سویرے جو سب سے پہلی بات ارشاد فرمائی۔ وہ یہ سوال تھا کہ کل ریف کی کیا خبریں آئیں؟ —— ریف میں غازی عبدالکریم اسپین کے مقابلہ میں جہاد کر رہے تھے۔ خبریں سن سن کر خوش سب ہی مسلمان ہو رہے تھے۔ لیکن محمد علی کے دل کی خوشی لفظوں میں بیان کرنے کے قابل کب تھی۔ خدا معلوم رات کو انھیں نیند کیسے آتی۔ رات ہی میں سوتے سے اٹھا کر ریف کی خبریں پوچھتے، یا اسی وقت اخبار پڑھنا شروع کر دیتے تو کچھ بعید نہ تھا —— میں نے عرض کیا کہ "ریف کی تو ایسی کوئی خاص خبر نہیں، البتہ مدینہ کے متعلق یہ خبر آئی ہے کہ نجدیوں نے مسجد نبوی پر گولہ باری کر دی ہے" چھوٹتے ہی بلا اک لمحہ کے توقف کے غصہ کے ساتھ کہا "جھوٹ ہے جھوٹ ہے کہیں ہمدرد میں چھاپ تو نہیں دیا؟" میں جی میں لرز گیا کہ اب ڈانٹ پڑ کر رہی۔ دل کڑا کر کے جواب دیا، کہ "ریوٹر کا تار تھا۔ سب ہی اخباروں میں آیا ہوگا۔ نہ کیونکر چھاپا جاتا۔ البتہ خبر ان احتیاطوں کے ساتھ دی گئی ہے" احتیاطوں کی تفصیل بیان کی۔ کہا "خیر غنیمت ہے" پھر سکون و سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "ان خبروں کے چھاپنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیئے۔ ہر ہر طرح کی جھوٹی خبریں آئیں گی، کہ مسلمان آپس میں خوب لڑیں" —— عارف صاحب کی بھی ایک عمر اخبار نویسی میں گزر چکی تھی۔ لیکن یہاں تک نگاہ صرف محمد علی ہی کی پہونچ سکتی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی تو خبر کو باور نہ کیا۔ اور صاف اُس فراست ایمانی کی جھلک دکھا دی۔ جس کا نقشہ ان الفاظ میں دکھایا گیا ہے۔ لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنٰت بانفسہم خیراً و قالوا ہٰذا افک مبین۔ نیز ولولا اذ سمعتموہ قلتم ما یکون لنا ان نتکلم بہٰذا سبحٰنک ہٰذا بہتان عظیم۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا ہو چکا تھا، یا ہو رہا تھا۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اور دفتر کے چپراسی نے آن کر کہا، کہ ٹیلیفون لکھنؤ سے بول رہا ہے۔ اور وہ

صاحب خود سرکار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ محمدؐ علی خود ٹیلیفون پر گئے۔ لکھنو سے چودھری خلیق الزمان بول رہے تھے۔ خلیق صاحب صوبہ کے لیڈروں میں تھے۔ لکھنو میونسپل بورڈ کے چیرمین، اور رائس وقت تک محمدؐ علی کے ایک مخلص نائب۔ انھوں نے کہا "مولوی عنایت اللہ صاحب مولانا عبدالباری صاحب کے بھیجے ہوئے۔ فرنگی محل سے ابھی آئے ہیں۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کل کے تار کے بعد اب خاموشی ناممکن ہے، مدینہ منورہ کی گولہ باری پر مسلمان کسی طرح ضبط نہیں کر سکتے۔ لکھنو میں ایک بڑا جلسہ کرنے والے ہیں۔ مجھ سے شرکت کے لئے کہا۔ میں نے کہا کہ مولانا محمدؐ علی کا مشورہ سب پر مقدم ہے۔ جو کچھ کارروائی ہو سارے مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ہو۔ سلطان ابن سعود کا اگر یہ جرم ثابت ہو جائے۔ تو پھر تو کسی مسلمان کو اختلاف نہیں رہ سکتا۔ مولوی صاحب یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے جواب کے منتظر ہیں، جو کچھ فرمائیے ان سے کہدوں۔" محمدؐ علی نے جواب میں کہا "بیشک جو کارروائی ہو متحدہ ہونی چاہئے۔ لیکن مجھے تو ابھی تک خبر ہی پر یقین نہیں سب سے مقدم خبر کی تحقیق ہے۔ تار لندن سے آیا ہے، اس میں حوالہ بیت المقدس کے نامعلوم ذرائع کا ہے۔ تحقیق کی بہترین صورت یہ ہے کہ خلافت کمیٹی بمبئی سے بیت المقدس مسلم سپریم کونسل کے نام جوابی تار دے۔ سپریم کونسل بھی اگرچہ انگریزوں ہی کے زیر اثر ہے۔ اور شریف کا بیٹا عبداللہ وہاں موجود ہے۔ تاہم مفتی امین الحسینی سے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور صحیح اور سچی خبر دیں گے۔ یہاں کارروائی جو کچھ بھی ہو، اس تحقیق کے بعد ہو، نہ کہ اس کے قبل، اس میں زیادہ دیر نہیں لگیگی۔ صرف ایک ہی دو روز لگیں گے۔ مولانا سے میری طرف سے بہت زور دے کر یہ کہہ دو کہ خدا کے لئے تھوڑے سے صبر و ضبط سے کام لیں۔ جوش کو بے محل نہ صرف ہونا چاہئے۔ شوکت کو ابھی بمبئی ٹیلیفون کریں۔ میں بھی انھیں ابھی فون کر چکا ہوں (یا کر رہا ہوں) آخری فقرہ اتنے دنوں کے بعد خوب یاد نہیں۔ خدا معلوم "کر رہا ہوں" کہا تھا یا کر چکا ہوں"۔ بمبئی محمدؐ علی کا فون کرنا اچھی طرح یاد ہے۔ خود ٹیلیفون

پر کھڑے ہو کر دیر تک شوکت صاحب کو بیت المقدس جوابی تار دینے کی ہدایتیں دیتے رہے تھے، غالباً وہ بمبئی کو پہلے ہی فون کر چکے تھے، اس کے بعد لکھنو والا فون آیا ــــــ آج اتنے عرصہ کے بعد ٹھنڈے دل سے دیکھیے، تو یہی بات بالکل ٹھکانے کی نظر آتی ہے لیکن بہت سے مہربانوں کی نظر میں اس وقت یہی معقول مناسب و ہوشمندانہ کارروائی قابل صد ملامت ٹھہری۔ اور محمد علی کی فرد جرم میں ایک اہم عنوان قرار پائی۔

قیامت خیز تار، رائٹر کا دیا ہوا، لندن کا چلا ہوا تھا۔ الفاظ یہ تھے :۔

بیت المقدس کا ایک پیغام مظہر ہے کہ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ نجدیوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور دو روز ہوئے کہ گولہ باری شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر اُس بڑی مسجد کے قبوں کو بہت نقصان پہونچا ہے۔ جس میں پیغمبر کا مزار ہے۔

خلافت کمیٹی کا پہلا وفد جس میں مولوی شفیع داؤدی۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عرفان قمر احمد صاحب (ایڈیٹر روزنامہ خلافت) وغیرہ شامل تھے۔ ابھی ابھی سلطان ابن سعود سے مل کر واپس آیا تھا۔ اور اُسے سلطان اطمینان دلا چکے تھے۔ کہ ہدم عمارات وغیرہ کے جو واقعات مکہ میں ان کی غیر حاضری اور لاعلمی میں پیش آ چکے تھے ان کا اعادہ مدینہ میں ہرگز نہ ہونے پائیگا۔ اس اطمینانی اطلاع کے بعد یوں بھی یہ تار قابل اعتماد نہ تھا۔ پھر اس کا اس چکر کے راستہ سے آنا اسے اور بھی مشتبہ بنا رہا تھا۔ پھر تار سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ نجدی فوج نے اصلاً حملہ شہر مدینہ پر کیا ہے۔ جہاں امیر علی ابھی تک مع اپنے لاؤ لشکر کے موجود تھا، نہ کہ مسجد نبوی پر۔ مسجد کے قبوں کو گزند محض ضمناً پہونچ گیا ہے، اور پھر روضۂ پاک کے گزند پہونچنے کے ذکر سے تو یہ تار تک خاموش تھا لیکن اندھا دُھند جوش کا بھلا ہو کہ ہر طرف یہی شور مچ گیا، کہ وہابیوں نے روضۂ رسول پر حملہ کر دیا! اور (معاذ اللہ) گنبد سبز پر گولہ باری شروع کر دی! ہندوستان کی ساری آبادیوں میں

جہاں جہاں بھی "خوش عقیدگی" کی حکومت تھی، پیر زادوں کی کوئی بستی تھی "مشائخ" کا کچھ بھی اثر تھا، بس ایک ہیجان کی رو دوڑ گئی کہ مردود وہابیوں نے گستاخیوں کی حد اور بے ادبیوں کی انتہا کر دی! بمبئی، کراچی، مراد آباد، لکھنؤ، لاہور، بدایوں وغیرہ جو خاص خاص شریفی مرکز تھے، سب کہیں بڑے بڑے جنگی جلسے ہونے لگے۔ اور جلسے ہنگاموں کی شکل پکڑتے گئے۔ لکھنؤ کے جلسے میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم مع اپنے رفقاء کے پٹتے پٹتے بچے۔ بمبئی میں کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہوا۔ کراچی میں مولوی ظفر[illegible] کی خبر لے لی گئی، بدایوں "شریف" نے کھلم کھلا سرکار برطانیہ سے مداخلت کی درخواست کر دی اور وہابی، حنفی، یا وہابی، سنی کی جنگ کا میدان، سالہا سال کے بعد تازہ جوش و خروش کے ساتھ از سر نو گرم ہو گیا! —— یہ ڈائری محمد علی سے متعلق ہے۔ کوئی شریفی سعودی جنگ کی تاریخ نہیں۔ ان اوراق میں اس جنگ کی تفصیلات کے منتظر نہ رہیئے۔ اس ڈائری میں تو صرف محمد علی کے حالات لکھے جائیں گے۔ اور حالات بھی بس وہی جو ڈائری نویس کے ذاتی علم میں ہیں!

لکھنؤ اپنی شاعری اور تخیل نوازی کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہے فسانۂ عجائب اور طلسم ہوش ربا کی داستانیں آخر اسی سرزمین پر "تصنیف" ہوئی۔ علماء و فضلا کا بھی شاعروں اور افسانہ گویوں سے بڑھ کر۔ جلسہ کا اشتہار جو شائع کیا، اس کا عنوان تھا "قیامت کبریٰ"، اور، اس کاغذی قیامت کبریٰ کی توضیح میں دوسرا عنوان رکھا، گنبد خضراء پر گولہ باری"! مضمون آفرینی کا یہ وہ مقام تھا۔ جہاں تک اثر جیسے تخیل نواز کے بھی ذہن کی بھی رسائی نہیں ہوئی تھی! تار میں صراحت صرف شہر مدینہ پر گولہ باری کی تھی۔ صراحت مسجد نبوی تک پر حملہ کی نہ تھی۔ تار سے اس کا صرف استنباط ہو سکتا تھا، نکتہ وران لکھنؤ نے مسجد نبوی الگ رہی۔ گنبد خضراء کی تصریح چھاپ دی! (تار میں روضہ پاک کا ذکر صرف مسجد نبوی کے پہچنوانے کی غرض سے تھا) العظمۃ للہ اسی پر اشتہار کی عبارت کو قیاس کر لیجئے، نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ روضہ اطہر کے

کے ساتھ اس گستاخی کا ذکر سنکر کون مسلمان خاموش رہ سکتا تھا؟ شریفی پارٹی کی بن آئی۔ خوب دل کھول کر اور جی بھر کر پروپیگنڈا ہوا۔ تحریر، تقریر، نظم، نثر، اخبار، اشتہار سارے ہی حربے نکل پڑے۔ لکھنو کا روزانہ پریس کہنا چاہئے کہ اسی جماعت کی مٹھی میں تھا۔ اسے کافی نہ سمجھ کر ایک مستقل روزنامہ اسی پروپیگنڈہ کی خاطر نکالا گیا۔ جالب صاحب مرحوم اپنی ذات سے فرنگی محل کے معتقد اور ہم مسلک تھے۔ لیکن ان کے ہمدم کے ڈائرکٹروں میں نسیم صاحب (مشہور رئیس لکھنو) اور خلیق الزمان صاحب جیسے "سعودی" حضرات بھی تھے۔ اس لئے ہمدم کو کچھ نہ کچھ دباؤ ان حضرات کا ماننا ہی پڑتا۔ غیر تعلقداروں کا روپیہ، ماتمی انجمنوں کی خدمات اور بعض غیر ذمہ دار حضرات کی آتش زبانیاں، سب نے مل ملا کر فضا ایسی تیار کر دی کہ جس کسی نے بھی کلمہ حق زبان سے نکالا، جھٹ اس پر وہابی ہونے کا فتوی لگا۔! ہمدرد کے وقائع نگار لکھنو اب تک فرنگی محل ہی کے ایک صاحب تھے۔ اب یہ تعلق قائم رہنے کا امکان ہی نہ رہا۔ ہمدرد نے شدید سے شدید اشتعال کے وقت بھی (بجز ایک استثنائی موقع کے، جب بمبئی میں مولانا شوکت علی پر حملہ ہوا ہے) اپنی متانت و سنجیدگی کی روش نہ چھوڑی، ذاتیات کے بجائے صرف اصول و مسائل سے بحث کی۔ قبول کے جواز و عدم جواز پر دو دو سنجیدہ مضمون دونوں فریقوں کے لیکر بحث کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ سلطان کے مذہبی معتقدات کی کبھی ہمنوائی نہ کی۔ اور فرنگی محل، خصوصاً مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔ لیکن موردِ عتاب ہونے سے نہ بچ سکا۔ ہمدرد کے اسٹاف کو مالک ہمدرد اور فرنگی محل کے باہمی تعلقات کا علم تھا۔ عارف صاحب خصوصاً۔ فرنگی محل کے معاملہ میں بہت ہی بچ بچ کر لکھتے رہے۔ لیکن ہیجان جذبات کے وقت۔ حدود کا لحاظ رکھتا کون ہے۔ ہمدرد غریب کو انعام یہ ملا کہ الٹے اس کے بائیکاٹ کی تبلیغ۔ و تلقین "خوش عقیدہ" حلقوں میں شروع ہو گئی؟

قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کے بحث صدیاں گزر چکنے کے بعد،

آج ہم کو آپ کو کیسی بے مزہ اور بے نتیجہ سی معلوم ہو رہی ہے لیکن اسی "نزاع لفظی" کے پیچھے کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ اور کیسی کیسی عزیز اور بیش بہا جانیں اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے اس پر نثار ہو چکی ہیں! یہ تو صدیوں قبل کی، اور ہندوستان کے باہر کی تاریخ تھی! آمین بالجہر، اور رفع یدین۔ کو آج ہم آپ چاہے جیسا غیر اہم قرار دے لیں۔ لیکن پچاس ساٹھ سال اُدھر۔ خود اسی ہندوستان کے اندر کیا کچھ خون خرابہ انھیں مسائل کے صدقہ میں نہیں ہو چکا ہے! اور پھر مسئلہ میلاد نبوی، اور اس کے اندر مسئلہ، قیام التعظیمة للہ! آج آپ یہ خیال کر کر کے کہ بھلا یہ بھی کوئی مہتم بالشان مسائل ہو سکتے ہیں۔ آج چاہے ہنس لیجئے، چاہے رو دیجئے لیکن کل تک کس درجہ ان کی اہمیت قلوب میں جاگزیں تھی! جو وقت ان مسائل کی گرما گرمی تھی! کون ایسا تھا۔ جو سیلاب کی زد میں آنے سے اپنے کو بچا سکا تھا! ——— بس بعینہ کیفیت ۱۹۲۵ء کے نصف آخر اور ۱۹۲۶ء کے نصف اول میں ان آنکھوں نے مسئلہ تبور و قباب کی دیکھی راشر کی اصل حکایت جس پر سارے قیضے چل پڑے تھے، یعنی مدینہ طیبہ پر گولہ باری تو عنت ریلود، ہو کر رہ گئی۔ اور ہر مجمع میں، ہر محفل میں، ہر گھر میں، بحث یہ چھڑی ہوئی کہ مزارات پر قبے بنوانا جائز ہیں یا ناجائز، مستحسن ہیں یا حرام، اور بنے ہوئے قبوں کو باقی رکھنا چاہئے یا ہٹا دینا۔ پھر اگر قبے اتارے جائیں تو ان کا محض "اتار دینا" کافی ہے۔ یا یہ گرائے بھی جائیں! وقس علیٰ ہذا۔ فرنگی محل کے علماء، اور ندوہ کے محققین سچ کا ایڈیٹر اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ سب کے سب اسی بحث میں الجھے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہوئے۔ آج ایک فریق کا مضمون نکلا۔ کل دوسرے فریق کی طرف سے اس کا جواب۔ آج ایک نے پمفلٹ لکھا، کل دوسرے نے اس کا رد شائع کیا نوبت مباحثہ و مناظرہ سے گزر کر شاتمہ و مجادلہ بلکہ کہیں کہیں مقاتلہ تک کی آگئی۔ گھر گھر میں اختلاف کی آگ دوڑ گئی۔ باپ اگر شریفی ہے۔ تو بیٹا سعودی۔ ایک بھائی قبہ شکن ہیں تو دوسرے قبہ نواز۔ محمد علی کو اپنی ذات سے ان بحثوں سے بہت ہی کم دلچسپی تھی۔ وہ انھیں فروع ہی نہیں۔ فروع در فروع کے درجہ میں رکھتے تھے، اور

رجحان طبع اگر کچھ تھا۔ تو فرنگی محلی ہی عقائد کی جانب، کہا کرتے تھے کہ" بلند وپختہ مزارات کو اسلام نے پسند یقیناً نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی تعمیر کی کوئی قطعی ممانعت یا بنے ہوئے مزارات کے گرانے کی تاکید۔ ابھی تک میرے علم میں نہیں آئی ہے جس روز آجائیگی میں خود ہی ہاتھ میں پھاوڑا لیکر تعمیل ارشاد کو آگے بڑھونگا۔ ہمدرد میں میرا ایک بہت مفصل مضمون دو نمبروں میں حضرات فرنگی محل کے جواب میں نکلا۔ محمد علی خود اس رائے اور مسلک سے زیادہ متفق نہ تھے۔ وہ جو اسوقت ابن سعود کی تائید کر رہے تھے۔ اس میں سلطان کے مذہبی معتقدات کو ایک ذرا بھی دخل نہ تھا۔ ان کی تائید تمامتر اس لئے تھی۔ کہ ان کے خیال میں اب ارض حجاز کو ہمیشہ کے لئے ملوکیت کے عذاب سے نجات مل رہی تھی۔ اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر شرعی جمہوریت کی بنیاد قائم ہو رہی تھی۔ باایں ہمہ جو "بدنامی" ان کی قسمت میں تھی ہوکر رہی۔ جذبات کے ہیجان و تلاطم میں۔ تحقیق کی فرصت کسے۔ اور صداقت کی پروا کس کو محمد علی کی وہابیت کی تشہیر کے لئے بس اس قدر کافی تھا کہ کسی وجہ سے اور کسی بنا پر سہی بہرحال وہ ہیں تو سلطان ابن سعود کے حامی و ہمدرد حنفیت اور قادریت، قوالی کی محفلیں اور عرسوں کی حاضری کوئی شئے بھی آڑے نہ آئی۔ اور گلی گلی۔ گھر گھر ڈھنڈورا یہ پٹ گیا۔ کہ محمد علی وہابی ہیں وہابی بلکہ وہابیوں کے سردار، اور ان موذیوں کے گرو گھنٹال!

سلطان ابن سعود کا تسلط ارض حجاز پر ہو چکا تھا۔ لیکن ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں بغاوت اب تک جاری۔ ستمبر کا پورا مہینہ حامیان و مخالفین ابن سعود کی کشمکش میں گزرا۔ ہر جگہ یہی آویزش۔ ہر طرف یہی چپقلش۔ لکھنؤ فرنگی محل کی پر قوت سرپرستی میں ابن سعود کے دشمنوں کا ایک زبردست مرکز۔ پوسٹر و پمفلٹ، مضامین

کارٹون نظمیں، ماتمی، انجمنوں کی آہ وبکا، تقریریں، جلسے اور ایک نام کی "آل انڈیا" کانفرنس چند مخلصین کی شرکت سونے پر سہاگہ کا کام کر گئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور، سالار لشکر، میمنہ اور میسرہ پر شیخ مشیر حسین قدوائی اور مولانا حسرت موہانی اور عقب میں شیعہ امراء و تعلقدار، خصوصاً راجہ صاحب محمود آباد اور ٹھاکر نواب علیخان، خلافت والے غریب کہاں تک مظالم سہتے اور آخر کب تک نہ بولتے؟ مولوی ظفر الملک اٹھے، اور چودھری خلیق الزمان نے ایک لمبی انگڑائی لی طے یہ پایا کہ باطل کے سارے اژدہوں کو نگل جانے کے لئے حق کا ایک "عصا" کافی ہے۔ نظر سب کی محمد علی پر پڑی۔ ۱۸ اکتوبر کو سیتاپور میں پروانشیل کانفرنس تھی۔ مولانا شوکت علی صدر تھے۔ اور گاندھی جی اور محمد علی بھی۔ صلاح یہ ٹھیری کہ واپسی میں ۲۰ اکتوبر کو محمد علی لکھنؤ چند گھنٹوں کے لئے ٹھہر کر ایک تقریر کر دیں۔ کہ ساری تاریکیوں کے بادل چھنٹ کر رہ جائیں۔ راقم سطور سیتاپور گیا۔ اور بات پکی کر آیا۔ تاریخ موعود آئی۔ اور تاریخ کے ساتھ ہی محمد علی وارد لکھنؤ ہوئے۔ مرید کا کام تو پیر کی حمایت ہی کرنا ہوتا ہے۔ پیری مریدی کی تاریخ میں شاید یہ واقعہ آپ اپنی نظیر ہو۔ کہ مرید مرشد کی مخالفت کرنے۔ علی الاعلان اور پرزور مخالفت کرنے دور دراز کا سفر کر کے اپنا وقت اور اپنا پیسہ خرچ کر کے آرہا ہے۔ بیعت، ارادات، محبت، عقیدت، سب کی بنیاد حق پر تھی، مخالفت تردید تغلیط کی بنیاد بھی حق ہی پر رہی۔ محبت اگر اللہ کے لئے تھی۔ تو اس علیگڈھ اور آکسفرڈ کے "نیچری" نے اس بیسویں صدی میں، اپنی مثال سے یہ دکھا دیا۔ کہ مخالفت بھی اللہ ہی کے لئے ہوسکتی ہے! الحب فی اللہ کے بعد البغض فی اللہ کی یہ کیسی دلربا تفسیر تھی!

مرید مرشد کا محض مطیع غلام ہی نہ تھا۔ عاشق و شیدا بھی تھا، احسانات سے زیر بار بھی تھا۔ پارٹی نے شرط یہ لگا دی تھی۔ کہ قیام ابکی چودھری خلیق الزمان کے ہاں ہو، وہ اپنے لوگوں میں سے، ایسے وقت فرنگی محل جانا کون گوارا کرے گا۔ سالہا سال کا معمول چھوٹنا، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس دل سے محمد علی نے اب کی فرنگی محل چھوڑ کر

خلیق صاحب کے ہاں قیام کیا۔ اتفاق کہئے یا جو کچھ، مولانا عبدالباری صاحب بھی عین اسوقت لکھنؤ سے باہر، ہزار ڈیڑھ ہزار میل دُور۔ حیدر آباد میں تھے، صبح ہوئی کہ محمدؐ علی کے گرد مجمع ہوگیا۔ پرانے معتقدوں اور مخلصوں کے ساتھ بعض نئے حواری بھی۔ محمد علی کی محبت میں نہیں، فرنگی محل کی ضد پر، "حُب" علی" میں نہیں، "بغض معاویہ"! اُدھر خود محمدؐ علیؒ فرنگی محل جانے کے لئے بیتاب "پارٹی" کا کوئی شخص کیوں ساتھ دیتا، بس یہی ڈائری نویس ہمراہ ہوا۔ اور خلیق صاحب کے موٹر پر محمدؐ علی فرنگی محل کے لئے روانہ لیکن مکین کے بجائے صرف مکان کی زیارت ہوئی۔ مولانا مرحوم کے متعدد اعزہ مولانا سلامت اللہ مولانا عنایت اللہ وغیرہم موجود۔ نیز جناب حسرت موہانی۔ دوپہر کا کھانا یہیں ہوا۔ اور دستر خوان ہی پر گرم گرم کھانوں کے ساتھ گفتگو بھی گرما گرم شروع ہوگئی۔ محمدؐ علی بجز اپنے مرشد کے اور کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہی نہ تھے۔ لیکن سوالات شروع ہوئے اور انھیں مجبوراً جواب دینا پڑا۔ جب رخصت ہوکر فرنگی محل کے پل پر موٹر کے قریب پہونچے ہیں۔ تو شایعت کرنے والوں سے گفتگو اتنے بلند لہجہ میں ہو رہی تھی کہ راہگیروں کا ایک خاصا مجمع لگ گیا۔ اس ڈائری نویس کو مجبوراً ہمت کرکے ایک بزرگ کے منہ پر ہاتھ رکھدینا، اور ادب کے ساتھ یاد دلانا پڑا، کہ" مولانا، یہ جو رہا ہے چورا ہا!

——— یہ سارے جزئیات، جذبات کی شدت اور حدت کا نمونہ دکھانے کے لئے قلمبند ہو رہے ہیں ——— مولوی ظفر الملک صاحب نے جلسہ وغیرہ کا انتظام تو سب کچھ کر رکھا تھا۔ لیکن خود شاید پیر کے زخم کے باعث معتکف تھے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے، محمدؐ علی فرنگی محل سے اُٹھ انھیں کے ہاں۔ دفتر سچ میں آئے اور یہیں ان کے ملاحظہ میں لکھنؤ کے بعض وہ اخبارات لائے گئے۔ جنھوں نے مزاح وظرافت کا نام لیکر تہذیب و شرافت و انسانیت کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ کر رکھا تھا۔ کلکتہ اور بمبئی میں بڑے بڑے بیرسٹروں کو جس طرح سالسٹر کا غذات مقدمہ دکھا دکھا کر پیروی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی پوزیشن اس وقت مولوی ظفر الملک صاحب کی تھی، انھیں خود جلسہ میں جانا نہ تھا، لیکن محمدؐ علی کو ہر طرح لیس کر دینا تھا۔ یہاں سے

محمد علی راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں آئے۔ جو اُس وقت یوپی گورنمنٹ کے ہوم ممبر تھے اُن سے ملاقات کا ہمیشہ کا معمول تھا اس میں ان کے سرکاری عہدہ کے باوجود کبھی فرق آنے نہ دیا۔ راجہ صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کر دیا۔ باتوں باتوں میں راجہ صاحب نے شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی کا ایک اعتراض نقل کیا۔ محمد علی نے ایک برجستہ جواب دیا۔ نہایت دلچسپ لیکن اتنا عریاں کہ کسی طرح بھی صفحہ کاغذ پر لانے کے قابل نہیں!

جلسہ کا مقام رفاہ عام کا عقبی صحن تھا۔ وقت وہی سہ پہر کا جو لکھنؤ میں عام طور پر جلسوں کا ہوتا ہے۔ جلسہ کے داعیوں میں شہر کے معززین، شرفاء اور ہر طبقہ کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ یہ ڈائری نویس سایہ کی طرح ساتھ ساتھ، جس وقت محمد علی جلسہ گاہ میں پہونچے ہیں۔ مجمع بہت بڑا پہلے سے پہونچ چکا تھا۔ ہم لوگ رفاہ عام کے ہال سے ہوکر گزرے۔ دیکھا کہ راجہ صاحب سلیم پور اور ٹھاکر نواب علیخاں تشریف فرما ہیں۔ مجھ سادہ لوح کو حیرت ہوئی کہ ان حضرات کا تشریف لانا کیونکر ہوا۔ صدارت کے لئے انتخاب چودھری خلیق الزماں صاحب کا ہوا۔ اور جلسہ شروع ہوا۔ پہلے ایک عرب توفیق شریف نے عربی میں تقریر کی اور ایک ایک فقرہ کا ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کرتے گئے۔ مغرب کا وقت اسی اثنا میں آگیا، اور نماز بڑی جماعت کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بعد محمد علی تقریر کو اٹھے۔ ان کا اٹھنا تھا۔ کہ معلوم ہوا ایک قیامت اٹھ کھڑی ہوئی! سب سے پہلے دور سے فرنگی محل کے ایک معتقد خاص کی طرف سے ایک سوال کی آواز اور اس آواز پر معاً ایک دوسری آواز، اور تیسری آواز اور پھر ایک ساتھ بیسیوں آوازیں! گویا ایک کورس تھا۔ جو بجائے نغمہ و ترنم کے شور وغوغا کی لے میں بلند ہو رہا تھا! اب سوالات موقوف اور بجائے ان کے، صرف یہ مطالبہ اور یہ نعرہ کہ "ہم نہیں سنیں گے، نہیں سنیں گے۔ حلق کی پوری قوت، اور چیخ کی انتہائی بلندی کے ساتھ فضا میں قائم! صدر مجلس بار بار نظم قائم رکھنے اور خاموش ہونے کی تلقین و ہدایت فرما رہے ہیں۔ چمکا کر بھی۔ اور گھرک کر بھی، لیکن جو محمد علی سے

بغاوت پر تل کر آئے تھے۔ وہ خلیق الزمان غریب کو کیا خاطر میں لاتے؟ ان غوغائیوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، زیادہ سے زیادہ چند درجن، بعض ماتمی انجمنوں کے ارکان پیش پیش شیعہ امراء اور تعلقداروں کی تشریف آوری کے معنی اب بالکل روشن تھے! صدہا ہزارہا دوسرے اشخاص جو جلسہ میں موجود تھے۔ دنگ و حیران متحیر و پریشان، کہ الہٰی یہ ماجرا کیا ہے۔ جھٹ پٹا تو یہی چکا تھا کہ اتنے میں ایک بڑا سا ڈھیلا، تخت صدارت کے سامنے، جہاں میں اور حسرت موہانی صاحب کے ایک ندیم خاص بیٹھے ہوئے تھے۔ آکر گرا۔ اور اس پر ایک شور برپا ہوا "لینا" "پکڑنا" "یہ کس کی حرکت ہے" وغیرہا۔ ایک ملیح آبادی سرخ ریش پیر مرد ڈنڈا لیکر اٹھے کہ "یہ بدمعاش یوں نہ مانیں گے" میں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اور اپنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ "خدا کے لئے کہیں ڈنڈا نہ چلا بیٹھے گا، غضب ہو جائیگا۔ حلقہ فرنگی محل کے ایک کھدر پوش متوسل کو دیکھا کہ گھوم پھر کے گویا اس لشکر کی کمان کر رہے ہیں محمد علی نے چلا چلا کر درود شریف پڑھا۔ اور پڑھوایا۔ لیکن اثر کس پر ہوتا؟ جب آل محمدؐ کے خطبات خود، میدان کربلا میں، امت ہی کے لئے بے اثر رہ چکے ہیں۔ تو آل محمد کا محض نام کب ہمیشہ اور ہر جماعت کا پر اثر کر سکتا ہے؟ مزید خلفشار گیس کے لیمپوں کی روشنیاں گل کی جانے لگیں۔ اور ایک بالکل ٹھر بونگ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حکومت اس وقت نہ عقل کی تھی نہ نقل کی نہ شریعت کی نہ شرافت کی بلکہ صرف شرارت اور ننگے پن کی! عارف روم نے مثنوی میں کہا ہے کہ ایک شخص جب سننا نہ چاہے، تو تو سنانے والوں کا ناطقہ بند کر سکتا ہے سہ۔

یک کس نامستمع ز ستیزہ ورد
صد کس گوینده را عاجز کند!

اور پھر جب غوغائیوں کی تعداد ایک نہیں۔ بلکہ دس بیس، پچاس ہو تو ظاہر ہے انہیں کون سنا سکتا ہے؟

پانچ منٹ، دس منٹ، بارہ منٹ، آخر صدر صاحب بھی کب تک صبر

وانتظار کرتے، کچھ دیر موقع دینے کے بعد آخر جلسہ برخاست کر دیا" بات رہ جاتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے۔" خدا کی شان ہے کہ یہ محمدؐ علی کی تقریر کے ساتھ سلوک غیروں کا نہیں خود مسلمانوں کا دیکھنے میں آیا۔ اور وہ بھی کہاں؟ متھرا اور بنارس میں نہیں۔ خاص مسلمانوں کے شہر لکھنؤ میں! کہاں ہزارہا کا مجمع، محض محمدؐ علی کا نام سنکر تقریر کے شوق و اشتیاق میں آیا تھا اور کہاں معدودے چند اشخاص کی شرارتوں نے یہ نوبت پہونچادی! محمدؐ علی جلسہ گاہ سے رخصت ہوئے اور پھر اسی ہال کے اندر سے گزرے۔ مخلصین اور معتقدین کا ایک جم غفیر ہمراہ بعض کا اصرار کہ جلسہ اب منعقد ہو۔ شورہ پشت عنقریب چلا گیا ہے۔ اس لئے مشتاقوں کا اشتیاق اب پورا کیا جائے۔ میری شامت کہ میں نے اس گروہ کی ترجمانی محمدؐ علی سے کی۔ اُسی بھرے مجمع میں میرے اوپر وہ زبردست ڈانٹ پڑی کہ آج تک اسی بھول نہیں سکا ہوں۔ ایک طرف یہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف فرنگی محل کے وہی کھدر پوش معتقد، جو غوغا کرنے والوں کی کمان کر رہے تھے۔ یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ "محمدؐ علی صاحب اور چودھری خلیق الزمان کے ہاں! یہ گویا اعتراف تھا۔ اس کا کہ اصل مخالفت محمدؐ علی سے نہیں، بلکہ ضد ان کے مقامی رفیقوں اور ہمدردوں سے ہے! ——— غوغائی سرداروں نے ایک عارضی "فتح" حاصل کر کے مستقل بدنامی اپنے سراوڑھ لی۔ شہر میں گلی گلی، گھر گھر ان پر لفریں ہونے لگیں۔ اور، اور تو اور، خود انھیں کے ہمخیالوں میں جو سنجیدہ اور صاحب فہم افراد تھے، مثلاً حسرت موہانی۔ سید جالب (ایڈیٹر ہمدم) وغیرہ انھوں نے بھی اس طریقہ کو پسند نہیں کیا۔ اور انھیں کے اخبار ہمدم نے علانیہ اس سے اپنی بیزاری ظاہر کی۔ اور ہندو مسلمان ساری شریف پبلک کے سامنے یہ سوال آگیا کہ مخالفت کا یہ طریقہ اگر چل نکلا تو آیندہ پبلک جلسوں کا آخر کیا حشر ہوگا۔ یہ تو یہ ہوا کہ جو شخص بھی کرایہ کے دس بیس لفنگوں کو جمع کر لیگا، جس مقرر کو چاہیگا روک دیگا۔

ڈھائی ہفتوں کی مدت ہوتی ہی کیا ہے۔ بات کہتے گزر گئی۔ ۸ر نومبر کو دوسرا جلسہ قرار پایا۔ اور ابکی مقام جلسہ بجائے رفاہ عام کے امین آباد میں یتیم خانہ اسلامیہ تجویز ہوا،

داعیان جلسہ میں پہلے سے بھی بہت زائد لوگ شامل ہوئے۔ کوئی نوے آدمیوں کے دستخط
اعلان پر تھے، جن میں وکیل بیرسٹر رئیس تاجر، علما، دکاندار، چھوٹی قوموں کے چودھری
سب ہی شامل تھے۔ اور محمد علی کے ساتھ ہی مولانا شوکت علی، اور جمعیۃ العلما، دہلی کے دو
مشہور و مقرر عالموں کو بلایا گیا۔ مولانا ظفر الملک بھی اپنا حجرۂ اعتکاف چھوڑ باہر نکلے
اور ابکی انتظامات گویا تمام تر انھیں کے ہاتھ میں رہے۔ ادھر مولانا عبدالباری فرنگی محلی
بھی سفر سے واپس آ چکے تھے، اور لکھنؤ ہی میں مقیم تھے، اخباری و تحریری جنگ، بدستور
بلکہ چہار چند جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ جاری۔ لکھنؤ کا مقامی پریس تقریباً سارے
کا سارا فرنگی محل کا ہمنوا لیکن باہر کے اکثر اخبارات یعنی علاوہ ہمدرد، زمیندار، مدینہ
خلافت، تنظیم، وغیرہ سب محمد علی کے ساتھ ادھر سے مضامین بکثرت نکلتے۔ اُدھر سے فرنگی
محل اور پھلواری سے اُن کے جوابات میں رسائل شائع ہوتے۔ ادھر خلافت کمیٹی جیسا زبردست
ادارہ موجود، اُدھر بھی اس کے جواب میں ایک نیا "آرگنائزیشن" انجمن خدام الحرمین کے
نام سے عالم وجود میں آ چکا تھا، اور اس کے کارکنوں کا نیا نیا جوش و ولولہ قدرتہً بڑھا ہوا
اصل مسئلہ یعنے نجدیوں کا روضہ مبارک پر حملہ کرنا، سو یہ روایت اب سب کے نزدیک ضعیف
کیا باطل محض موضوع ثابت ہو چکی تھی۔ اب نہ اس پر بحث تھی نہ اس کا کوئی تذکرہ ——
جب جذبات بھڑک جاتے ہیں۔ تو لوگ اصل حقائق اور نفس مسائل کی طرف سے اسی
طرح غافل و بے پروا ہو جاتے ہیں —— بلکہ اب سارا زور اور ساری گرماگرمی وہابیت
اور خوش عقیدگی" کی باہمی جنگ میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف سے یہ اصرار کہ
قبوں اور پختہ قبروں کا نام و نشان بھی دنیا میں نہ رہنا چاہیے۔ اور جو یہ کر گزرا وہی
مجاہد ہے۔ غازی ہے، سچا متبع سنت ہے۔ اور دوسری طرف یہ ضد کہ جس نے قبوں کو
ہاتھ لگایا اُس بے ادب و گستاخ کے جہنمی و ملعون ہونے میں کیا شک، وہ رسول اور آل
رسول کا کھلا ہوا دشمن اور اسلام کا مجرم و باغی ہے —— دو ڈھائی مہینے کے اندر
جس کثرت سے مضامین و رسائل کا انبار اس ایک موضوع پر لگ گیا، اگر انھیں یکجا کرے
تو دفتر کا دفتر مجلدات کے مجلدات تیار ہو جائیں۔ اور جب ہر فریق کے جذبات اس

حد تک مشتعل ہو جائیں، اور ہر گروہ کا دینی جوش اس درجہ تک پہونچ جائے، تو ظاہر ہے
کہ وہ کس غیظ و غضب کس نفرت و بیزاری کے ساتھ دوسرے فریق اور اس کے پیشواؤں
کو دیکھے گا۔

قبہ شکنی اور قبہ نوازی کے اس ہنگامہ و غلغلہ میں بجز ادھر ادھر ڈگمگائے
جادہ مستقیم پر گنتی کے جن چند لوگوں کے قدم، ثابت و استوار رہے، اُن کے سردار و پیشوا
محمد علی تھے محمد علی اس "حرب عقائد" سے بے تعلق و ماورا، اس سارے قضیہ کو کہیں بلند
تر زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ سلطان ابن سعود کے دوست ہمدرد و ہوا خواہ تھے
تو صرف اس بناء پر کہ ان کے خیال میں اب جزیرۃ العرب ہمیشہ کے لئے اغیار کے خطرۂ
دست برد سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اور اب ارض حرم میں صحیح و "آزاد" اسلامی" یعنے
عالم اسلام کی مشترک حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ قبے رہیں یا گریں، بہر حال محمد علی
کی نظر میں سلطان نجد کی حیثیت ارض حرم کو شریفی مظالم سے نجات دلانے والے محسن
کی تھی، اور امید یہ تھی۔ کہ اب حجاز پر کسی ایک نسل یا خاندان کی موروثی ملکیت کی بجائے
اسلامی جمہوریت قائم ہوگی۔ آیندہ حرمین شریفین کا نظم ونسق، مسلمانان عالم کی سیادت
میں رہیگا۔ اور ہر حاجی و زائر کو خواہ شیعہ ہو یا "نیچری" "وہابی" ہو یا بدعتی، خارجی ہو یا
معتزلی اپنے اپنے طریق پر اپنے حج و آداب زیارت میں آزادی رہے گی۔ محمد علی کو جزئیات
عقائد میں پڑنے کی فرصت کہاں تھی۔ ان کے پیش نظر تو اتنا عظیم الشان کام تھا۔ جس
کی نظیر ہی بعد خلافت راشدہ کے کہیں نہیں ملتی۔ وہ اپنی محض انھیں توقعات اور امیدوں
کی بناء پر سلطان کے ہمدرد و حامی تھے، اور باوجود ذاتی طور پر قبہ نوازی کی جانب
میلان و رحجان رکھنے کے قبہ نوازوں کی ہنگامہ آرائی کو اپنے مقاصد عالیہ کے حق میں
سخت مضر سمجھ رہے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ کسی طرح ہندوستان میں یہ شورش فرو ہو،
اور سلطان کی بجائے مخالفت و مزاحمت کے، ہندوستان سے تائید و امداد حاصل کریں
—— ان بلند خیالیوں اور ان باریکیوں تک نظر کس کی پہونچتی ہے کس نے ان مسائل

کے شب و روز سوچنے پر اپنے دل و دماغ کو اس طرح وقف کر رکھا تھا؟ نتیجہ قدرتاً یہ نکلا کہ اُدھر ہندوستان کے سارے قبہ شکن خوش ہوئے کہ محمد علی جیسی زبردست شخصیت کی تائید ہاتھ آگئی، اور ادھر ملک بھر کے قبہ نواز اس درجہ میں ناخوش و ناراض یہ راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ، راستہ کا سب سے بھاری پتھر یہی محمد علی ہے۔ اگر اسے گرا لیا، تو بس بیڑا پار ہے۔ جتنے کارٹون ان چند ہفتوں کے اثناء میں محمد علی کے نکل گئے۔ جتنی ہجو نظمیں چھپیں۔ جتنی گالیاں اور کوسنے سننے پڑے، ان کے سہنے اور برداشت کرنے کے لئے محمد علی ہی کا جگر درکار تھا!۔

مولانا محمد نعیم فرنگی محلی قدس اللہ سرہٗ اس دور آخر میں، ایک جامع شریعت و طریقت بزرگ گزرے ہیں۔ جب بیعت لیتے۔ تو مرید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتے کہ اگر حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے میری مغفرت کر دی، تو وعدہ کرتا ہوں کہ اسوقت تمہارا بھی خیال رکھوں گا۔ اب تم اسی طرح کا اقرار مجھ سے کرو کہ حق تعالیٰ کے ہاں تمہیں مقبول ثابت ہوئے۔ تو وعدہ کرو کہ مجھے نہ بھول جاؤ گے۔ معاہدہ بیعت تو طرفین سے ہوتا ہے۔ پیر و مرید دونوں میں سے جس کا نصیب یاوری کر جائے وہ دوسرے کو اپنے ساتھ گھسیٹے۔ پیری مریدی کے سلسلہ میں عام عقیدہ دلوں میں جما ہوا ہے کہ حقوق سارے کے سارے مرشد کو حاصل رہتے ہیں۔ اور فرائض کا بار سارے کا سارا مرید کے ذمہ رہتا ہے مولانا کا تعامل اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ کچھ حقوق مرید کے بھی ہوتے ہیں۔ اور دونوں پر ایک دوسرے کی ہواخواہی واجب ہوتی ہے —— مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ کا فضل و کمال کسی التعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح نے مکہ معظمہ سے اپنی تازہ تصنیف "فیصلہ ہفت مسئلہ" کے دو نسخے ان کے پاس گنگوہ روانہ فرمائے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مرشد کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ سر اور آنکھوں پر رکھتا۔ مولانا نے ان کی تعظیم و تکریم یہ کی کہ ان ساری کتابوں کو آگ میں جلوا دیا۔ اس لئے کہ مولانا کی رائے میں حضرت حاجی صاحب کی تحقیق صحیح نہ تھی۔

اور ایسے رسائل کی اشاعت مصالح امت کے حق میں مضر تھی۔ مرشد نے اسے سُنا اور بالکل روا رکھا۔ مرید کی طرف سے ذرا بھی انقباض نہ ہوا۔ اور سارے تعلقات شفقت و عنایت بدستور رکھے ـــ ان دونوں حکایتوں سے نکلتا یہ ہے کہ عوام اپنی افراطِ عقیدت اور غلوے خوش عقیدگی میں جو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ محققین نے مرید کے ضمیر کی آزادی تسلیم رکھی ہے اور مرشد کے ساتھ اختلاف کو کم از کم درجۂ امکان و احتمال میں تو ضرور مانا ہے۔

محمدؐ علی کے دامن پر خوش عقیدہ گروہ کی طرف سے ایک بہت بڑا داغ پیر کی مخالفت کا سمجھا جاتا ہے، اور اچھے اچھوں کی زبان پر یہ فقرہ آجاتا ہے کہ کچھ بھی سہی، اور کسی وجہ سے بھی ہو، پیر کی مخالفت آئین طریقت میں تو کفر سے تو کم نہیں، حالانکہ یہ مخالفت جو کچھ بھی تھی سلوک و طریقت کے باطنی معاملات میں کیا معنی۔ شریعت ظاہری کے بھی کسی مسئلہ میں نہ تھی۔ پیر و مرید میں یہ شدید اختلاف بلکہ تصادم جو پیش آیا۔ عقائد سے متعلق ذرہ بھی نہ تھا۔ محمدؐ علی کا کہنا یہ تھا کہ سیاسیات حجاز بلکہ سیاسیات عالم اسلامی کی صورت حال کے سمجھنے میں اس وقت مولانا عبدالباری صاحب کو غلط فہمی ہو رہی ہے، وہ غلط اطلاعات پر اعتماد کر کرکے۔ سلطان کو ماثر مسلمین کا دشمن سمجھ رہے ہیں، اس لئے اس کی مخالفت پر تل گئے ہیں۔ حالانکہ سلطان ایک مبشّر ہے۔ حجاز کو ملکیت سے نجات دلانے والا ہے۔ جمہوریت و شوریت کی بنیاد قائم کر کے خلفائے راشدین کی سنت کو تازہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ سیتاپور میں ایک تقریر کے موقع پر لوگوں نے جب یہ سوال کر دیا کہ آپ تو ہمیں ابن سعود کی طرف بلا رہے ہیں، اور آپ کے مرشد اس کے برعکس ابن سعود کو نکلوانا چاہتے ہیں، یہ پیر و مرید میں مخالفت کیسی؟ تو محمدؐ علی نے برجستہ جواب دیا کہ یہ مخالفت نہیں ہے۔ رائے و بصیرت کا اختلاف ہے جن معاملات میں مجھے ہدایت و رہنمائی کی ضرورت تھی وہ میری دستگیری کر رہے ہیں۔ جس مسئلہ میں انھیں خود صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے میرا فرض ہے کہ میں ان کی اعانت کروں" ـــ بات صاف اور واضح تھی لیکن دنیا اتنی نیک اور آشتی پسند کب رہی ہے؟ دنیا کو تو ہمیشہ لڑائی دیکھنے میں مزہ آیا ہے۔ جب امیر المومنین

علیؓ اور ام المومنین عائشہؓ کے درمیان نفاق ڈلوانے والوں کی کمی نہ تھی تو محمد علی اور ان کے مرشد کس شمار میں ہیں۔ ادھر ہر وقت یہ کہہ کہہ کر ابھرا جاتا تھا کہ دیکھئے یہ آپ کے مرید ہیں مرید ہو کر اور پیر سے یہ بغاوت، نافرمانی اور گستاخی، یہ مرید رہے کب؟ مریدی سے ان کی عاق ہونے کا اعلان کیجئے۔ ایسے وہابی اور نیچری کو اپنے مریدوں کے حلقہ میں رکھنے سے نتیجہ کیا؟ اور ادھر بار بار یہ صلاحین اور کمیٹیاں ہوتی تھیں کہ جو کچھ بھی ہو جائے۔ بہرحال اب محمد علی کو مولوی عبدالباری سے ہرگز نہ ملنے دیا جائے ہمیشہ کے اجنبی اور بیگانے اس وقت ہمدرد اور مخلص بن بن کر آتے تھے اور بے تکلفی کی جرات کے ساتھ پھٹ سے یہ سوال کر بیٹھتے تھے کہ یہ تو فرمائیے اب فسخ بیعت کا اعلان کب ہوگا؟ ہم لوگ اس ذلت کو اب مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ ملیح آباد کے ایک اجنبی نوجوان نے میرے سامنے محمد علی سے یہ سوال کر دیا۔ محمد علی نے روکھے ہو کر جواب دیا۔ "یہ معاملہ بالکل میری ذات کا ہے آپ کو کسی قومی معاملہ پر گفتگو کرنا ہو تو کیجئے۔" ادھر اگر محمد علی پر جی کھول کر تبرّے ہو رہے تھے آوازے کسے جا رہے تھے۔ کارٹون بن رہے تھے۔ ہجوین کہی جا رہی تھیں، تو ادھر سودی پریس میں مولانا عبدالباری مرحوم کی تضحیک و توہین کا بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہا تھا۔ یہاں تک کہ ان کے ایک عزیز قریب نے۔ پارٹی کے مشورہ سے (جس میں اس ڈائری نویس کا مشورہ بھی شامل تھا) فرنگی محل کا کچا چٹھا "ایک بڑے اشتہار کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ چٹھا" خدا جانے سچا تھا یا نہ تھا لیکن کچا، یقیناً تھا!۔

۸ر نومبر اتوار کا دن تھا۔ کہ محمد علی دس بجے دن کو دہلی سے وارد لکھنؤ ہوئے اسی ٹرین سے جمعیتہ العلماء کے بھیجے ہوئے مولانا عبدالحلیم صدیقی اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی بھی آئے۔ نیز عارف صاحب سب ایڈیٹر ہمدرد، مولانا شوکت علی دو گھنٹے قبل بمبئی کی طرف سے آ چکے تھے، فرنگی محل کے مقابلہ کا مورچہ، چودھری خلیق الزمان کا مکان تھا۔ قیام انکی بھی علی برادران کا وہیں ہوا۔ جذبات کا ہیجان اتنے زوروں کا تھا کہ کل

تک جو مخلص دوست رفیق کار و شریک عمل تھے آج ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، عزت و آبرو کے خواہاں تھے، یہ دو ڈھائی ہفتہ کا وقفہ جو لا۔ اس میں جذبات دھیمے پڑنیکے بجائے اور بھڑک چکے تھے اور نفرت و عداوت کے شعلے بلند سے بلند تر ہو چکے تھے۔ ادھر یہ ٹھن چکی تھی، کہ جو کچھ بھی ہو فرنگی محل کو ابکی نیچا دکھا کر رہنا ہے ادھر یہ ضد سما گئی تھی کہ ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے "شہر کے نوے وہابیوں" کا طلب کیا ہوا جلسہ کامیاب نہ ہونے پائیگا۔ داعیان جلسہ نے انتظامات بڑے اعلیٰ پیمانے پر کئے تھے اور مولوی ظفر الملک صاحب سب کے نگران اعلیٰ تھے، لیکن مخالفین جلسہ کی ریشہ دوانیوں کا نمبر اس سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اور سب جانتے ہیں کہ کسی جلسہ میں نظم قائم رکھنے کے بمقابل اس میں بد نظمی اور برہمی پیدا کرنا کتنا آسان ہے خبریں یہ گرم تھیں کہ آج مخالفین پچھلے جلسہ کی طرح محض خلق کی قوت سے نہیں بلکہ ہاتھ پیر کی قوت سے بھی پوری طرح کام لیں گے۔ اور جنھوں نے عرب میں قبے توڑے ان کے ہمدردوں کے سروں کے قبے ہندوستان میں توڑ کر رہیں گے! ——— میں حسب معمول محمد علی کی آمد سن کر دو ایک روز قبل دریاباد سے چل کر لکھنؤ آگیا تھا۔ یہ ساری خبریں سنیں۔ یہ بھی سنا کہ سلیم پور اور اکبر پور کے شیعہ تعلقداروں کے ساتھ ابکی گدیہ کے سنی تعلقدار کا بھی ساز ہو گیا ہے اور اس اتحاد ثلثہ نے جلسہ کو درہم و برہم کرنے کے لئے دیہات سے اپنی رعایا کو طلب فرمایا ہے۔ بعض خبریں اس سے بھی بڑھ بڑھ کر وحشتناک سنیں۔ دل اُسوقت نہ انھیں یقین کرنا چاہتا تھا۔ اور نہ اس وقت بیان کرنا۔ حسب معمول اسٹیشن پر محمد علی سے ملا۔ موٹر پر انھیں کے ساتھ بیٹھا اور اسٹیشن سے مکان تک مفصل رپورٹ ان کے گوش گزار کر دی۔ وہاں اندیشہ و ہراس پیدا ہونا کیا معنی اطمینانِ قلب کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ یہاں بیان کرتے دل ہولا جاتا تھا وہاں اپنے کو خطرہ کی اصلی زد میں سنکر ذرا بھی اثر، ذرا بھی تغیر نہ ہوا اللہ جیسے بڑا بناتا ہے۔ اس کا ظرف تحمل، وحوصلہ بھی بہت بڑا کر دیتا ہے۔ فرنگی محل ابکی بھی محمد علی گئے۔ جب مولانا عبدالباری کی عدم موجودگی میں گئے تھے تو ابکی تو وہ موجود تھے۔ ابکی کیوں نہ جاتے، ابکی میں ہمراہ نہیں گیا۔ بالکل تنہا گئے۔ اور ملاقات بالکل تخلیہ کی رہی محمد علی تو رقیق القلب تھے ہی ان کے مرشد

بھی اُن سے کم نہ تھے۔ جذبات سے بہت جلد متاثر و مغلوب ہو جاتے تھے۔ بچھڑے ہوئے مرید کو ایک بار پھر اپنے آستانہ پر دیکھ، گلے سے لپٹ گئے اور لپٹ کر رو لئے، ایک صاحب نے مشہور یہ کر دیا۔ کہ دونوں مل کر خوب روئے، محمد علی نے مجھ سے اس کی پرزور تردید کی، اور تصریح کے ساتھ کہا، کہ اس موقع پر میرے ایک بھی آنسو نہیں نکلا۔

آج کا دن افواہوں اور دھمکیوں کا تھا۔ طرح طرح کی افواہیں سننے میں آرہی تھیں۔ مار پیٹ کی افواہیں، گالم گلوج کی افواہیں، فوجداری اور لٹھ بازی کی افواہیں، خون خرابی کی افواہیں! اور دھمکیاں یہ مل رہی تھیں کہ آج شہر کے۔ "وہابیوں" اور "سعودیوں" کی خیر نہیں۔ ملیح آباد کے کچھ لوگ چودھری خلیق الزماں اور مولانا ظفر الملک کے ساتھ تھے۔ اُن سے مقابلہ کے لئے دیہات سے لٹھ بند سپاہی بلوائے گئے ہیں۔ اور اودھ کے تعلقداروں نے اپنی اپنی رعایا کی فوج بھرتی کر بلائی ہے۔ ممکن ہے ایسی ہی خبریں ہمارے ہاں سے متعلق دوسرے فریق کو بھی مل رہی ہوں لیکن میرے علم میں تو بس اُسی فریق کی تیاریوں اور جارحانہ تیاریوں کی خبریں آتی رہیں۔ مولوی عبدالرحمن ندوی نگرامی مرحوم بڑے نیک اور معصوم صفت تھے بیچارہ نے روزہ رکھ لیا، کہ اگر کہیں شہادت ہی کی نوبت آگئی، تو حالت صوم میں شہادت کا اجر مزید ہے۔ جلسہ کا وقت تو بعد عصر تھا۔ میں بعد ظہر کھانا کھا خلیق صاحب کے ہاں آگیا۔ خوب یاد ہے کہ کھانا کھاتا جاتا تھا۔ اور خیال کرتا جاتا تھا۔ کہ ممکن ہے یہ زندگی کا آخری کھانا ہو ایسی ایسی ہولناک روایات کان میں پڑ چکی تھیں۔ جلسہ اور جلسہ گاہ دونوں کے انچارج مولوی ظفر الملک صاحب تھے، انھوں نے ازراہ احتیاط منع کر دیا تھا کہ کوئی شخص لاٹھی لیکر جلسہ میں نہ آئے (گو مخالفین کا بیان ہے کہ لاٹھیوں کی ایک تعداد پہلے سے جلسہ گاہ میں مخفی کر لی گئی تھی واللہ اعلم) اس پر بھی دوپہر ہی سے نہتوں اور لٹھ بندوں دونوں کا مجمع شروع ہوگیا۔ جلسہ گاہ کا دروازہ ابھی بند تھا مخالفین نے باہر ہی سے گویا پورا محاصرہ کر لیا۔ اور جا بجا اپنے مورچے قائم کر لئے،

خلیق صاحب کے ہاں منٹ منٹ پر خبریں پہونچ رہی تھیں، میں خود گھبرا چلا اور میری ہی طرح کے کمزور دل والے بھی، لیکن علی برادران اور خود خلیق صاحب کے نہ چہرہ پر شکن تھی، نہ کسی انداز و گفتار میں کوئی خوف و ہراس۔ محمد علی بیٹھے ہوئے بہ اطمینان باتیں کر رہے ہیں اور اس کے منتظر کہ کسی طرح جلسہ کا وقت آئے اور یہ روانہ ہوں!

وقت خدا خدا کرکے آیا۔ جلسہ گاہ کی عمارت کچھ زائد دور نہ تھی۔ علی برادران سواری پر روانہ کئے گئے۔ اور پیچھے پیچھے دوسرے راستہ سے ہم لوگ جمعیتہ العلماء والے مولوی صاحبان، چودھری خلیق الزماں، اور یہ ڈائری نویس جلسہ گاہ پر پہونچے، تو ایک عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آیا۔ جو خبریں کانوں سے سنی تھیں، وہ عجیب تھیں ہی، جو باتیں آنکھوں سے دیکھنے میں آئیں، وہ عجیب تر نکلیں، دیہات کے نیچ ذات کے ہندو، پارسیوں وغیرہ کا ایک جم غفیر لاٹھیاں لئے ہوئے، ارد گرد گھیرا ڈالے ہوئے، اور ان کے سینہ پر نئی نَو خیز انجمن خدام الحرمین کا تمغہ "خادم الحرمین" لگا ہوا! میں اور آپ، زید اور عمر اور بکر، کس شمار میں ہیں، ایسے عجیب وغریب "خادم الحرمین" چشم پیر فلک نے بھی کبھی بھی کیوں دیکھے ہونگے! اور انھیں کے درمیاں جا بجا فرنگی محل کے متوسلین، اور کم از کم ایک صاحب جو خاص فرنگی محل کے ہیں چلا چلا کر وعظ فرما رہے ہیں، کہ یہ وہابی مردود گستاخ ہیں۔ بے ادب ہیں۔ روضۂ رسول کے دشمن ہیں۔ شاہ مینا صاحبؒ (لکھنوی) کا مزار کھود ڈالنے کی فکر میں ہیں۔ و قس علی ہذا۔ کیسی تحقیق شرعی، اور کہاں کا استدلال عقلی، بس ایک غل اور ہنگامہ، شور اور پکار، ٹہر بونگ اور چپقلش، ہر شخص دروازہ پر پلا پڑتا ہے کہ دروازہ کھلتے ہی میں ہی سب سے پہلے داخل ہو جاؤں، اور دروازہ کے تنگ زینہ پر ہجوم کا ریلا اس بلا کا، کہ تنہا اور دبلا پتلا آدمی تو اب کچلا اور جب کچلا! علی برادران سواری پر تھے وہ چار منٹ قبل پہونچ چکے تھے، ان کا داخلہ میں نہ دیکھ سکا، مگر سنا ہے کہ لٹھ بند "خدام الحرمین" انھیں دیکھ، خود ہی مسحور ہو گئے سا اور محمد علی اور شوکت علی کی جے پکارنے لگے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو یہ دیکھا کہ خلیق صاحب

کے لئے بھیڑ خود بخود چھنٹتی گئی - اور راستہ از خود نکلتا آیا - اس سے قیاس کرتا ہوں کہ علی برادران کا استقبال اُن کے شان ہی کے شایاں ہوا ہوگا ——— مجھے یہ تحقیق کبھی نہ ہو سکی، کہ آیا گنوار باسیوں کو "خدام الحرمین" بنانے کی تحریک مولانا فرنگی محلی مرحوم مغفور کی اجازت یا کم از کم علم کے بعد ہوئی تھی یا یار لوگوں نے یوں ہی بالا بالا یہ کارروائی کر لی تھی - کم از کم مجھے تو مولانائے مغفور کے ساتھ یہ سوءِ ظن قائم کرنے کی جرات نہیں ہوتی اور محمد علی بھی مولانا کے مرتبہ کو اس سے ارفع سمجھتے رہے -

---

تاریخوں میں جب یہ پڑھتا تھا - کہ حضرت خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مروان اور فلاں فلاں یہ یہ جعلی کارروائیاں حضرت کے نام سے کر گزرے، اور لوگوں نے اس کا انتقام حضرت سے لیا - یا حضرت خلیفہ رابع رضی اللہ عنہ کے وقت میں مالک اشتر اور فلاں فلاں افراط ہوا خواہی میں خود خلیفہ کی نافرمانی کر کر بیٹھے، اور بار بار حدود سے باہر نکل نکل گئے، تو دل میں یہ باتیں پوری طرح اترتی نہ تھیں، قدرت نے اس موقع پر ان تاریخی اور نفسیاتی حقایق کا ایک چھوٹے پیمانہ پر، اس عہد کی بساط اور موجودہ ظروف کے مطابق مشاہدہ کرا دیا - اور خبر اور معائنہ کے درمیان "شنیدہ" اور "دیدہ" کے درمیان جو فرق ہے، واضح و ظاہر ہے ! عجب عجب کارروائیاں ادھر سے بھی ہوتی رہتیں اور اُدھر سے بھی - مقصد محض یہ ہوتا - کہ اشتعال برابر بڑھتا رہے، اور اختلاف کی آگ کسی طرح بجھنے نہ پائے، ادھر کی کارروائیوں کا علم ذرا تفصیلی ہے اور عینی اُدھر کی حرکتوں کا علم محض اجمالی ہے اور وہ بھی سماعی - بعض صاحبوں کو ان کانوں نے براہ راست اور بلا واسطہ یہ کہتے سنا کہ "اور جو کچھ بھی ہو، لیکن محمد علی اور فرنگی محل میں اب میل نہ ہونے پائے - اسی کا خطرہ ہر وقت ہے - محمد علی اگر کہیں پھر ادھر مل گئے تو سارا کیا کرایا اکارت جائیگا - ہمارے آپ کے کسی کے کئے کچھ نہ بن پڑے گی اب ساری کوشش اسی کی رہنی چاہیئے - کہ محمد علی کسی حال میں بھی فرنگی محل سے نہ صاف ہونے پائیں - اس ڈائری نویس کے بارے میں غلط یا صحیح (زیادہ تر غلط اور کمتر صحیح)

خیال پھیلا ہوا تھا۔ کہ اسے محمد علیؒ کے مزاج میں کچھ تھوڑا بہت دخل ہے۔ اس لئے اس قسم کی زیادہ تر فرمائشیں اسی خاکسار سے کیجاتی تھیں، اور ہمدرد، زمیندار وغیرہ میں جو کچھ نکلتا رہتا تھا، وہ کچھ تو خود اسی کے قلم کا ہوتا تھا۔ اور کچھ اسکے اشارہ پر دوسروں کا لکھا ہوا محمد علی غریب کو دوسرے اخبارات کے مضامین کی تو اکثر خبر بھی نہ ہوتی، خود ہمدرد میں اگر کوئی چیز عارف صاحب (انچارج ایڈیٹر) کی مہربانی سے ایسے نکل جاتی، جس میں فرنگی محل پر ذاتی وشخصی تعریضیں ہوتیں، تو سخت ناخوش ہوتے، لیکن چھپ چکنے کے بعد تیر کمان سے نکل چکا ہوتا۔ ادھر فرنگی محلی پارٹی یہ سمجھتی، کہ یہ سب کچھ محمد علی کے علم وایما سے ہو رہا ہے یہ سارا حساب محمد علی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔ اور دلوں کا بخار محمد علی کی توہین وتذلیل سے نکالا جاتا۔ گنتی کے چند افراد ایسے تھے جو محض اصول کے خاطر، پورے خلوص کے ساتھ محمد علی کے شریک حال تھے اور ان چند میں ایک ممتاز (اپنے کو گمنام وبے نشان رکھنے کے باوجود ممتاز) شخصیت، شیخ الہند کے مرید ومسترشد، جوانمرد وجوانمرگ، عبدالرحمن ندوی نگرامی کی تھی ——— باہر کے بیدردوں کو کیا خبر، کہ محمد علی کے دل وجگر پر اس وقت کیا گزری تھی۔ پیر ومرشد سے جنگ، اور پھر کیا مرشد، جس کے ساتھ روحانی تعلقات کے ساتھ ساتھ مادی تعلقات بھی محبت کے دوستی کے، سالہا سال کی رفاقت وشرکت عمل کے گہرے اور شدید تھے، آسان نہ تھی، محمد علی جیسے شیر دل کے لئے بھی آسان نہ تھی، پچھلے جلسہ کے موقع پر تو خیر مولانا لکھنو سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور تھے، اور یہ عذر محمد علی کے لئے کافی تھا، ابکی تو خود مولانا یہاں موجود انھیں کے شہر میں، انھیں کے مریدوں کی سپہ سالاری میں عین انھیں کی انجمن (مولانا مرحوم خدام الحرمین کے صدر تھے) کی طرف سے یہ استقبال محمد علی کا ہو رہا تھا، اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلاتے؟ سنی کو ان سنی بارہا کر چکے تھے، اب دیکھی کو ان دیکھی کیسے بنا لیتے، ؟

۱۹۱۶ء کے اوائل کا ذکر ہے، جب علی برادران قید فرنگ میں تھے کہ دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کا ریلا زور وشور سے آیا۔ مظلومیت کا اشتراک، اکثر ہمدردی، یکجہتی

پیدا ہی کر دیتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی میدان میں سنگینوں اور گولیوں کا نشانہ بنائے گئے تھے، اسی ہیجان اتحاد کے وقت جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا اس میں آریہ سماجیوں کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے مسجد کے ممبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، جلسہ کے بعد، باہر کے مسلمانوں نے لے دے شروع کی۔ کہ مسجد کے اندر ہندو کیسے گھسا، اور گھسا تو خیر گھسا، مسجد کے ممبر پر بھی چڑھ گیا! اس اعتراض میں پیش پیش فرنگی محل بھی تھا زمانہ کی نیرنگی دیکھئے، کہ ۱۹۲۵ء میں یہی فرنگی محل تیج ہندوؤں اور پاسیوں کو دن دہاڑے کھلے خزانے، ہانکے پکارے، خادم الحرمین" بنا رہا تھا! گویا ۱۹ء میں اگر ادنیٰ ذات کے معزز ہندو مسلمانوں کی اجازت سے، مسجد کے اندر داخل ہونیکے قابل نہ تھے، تو ۱۹۲۵ء میں نیچی ذات کے ادنیٰ ہندو، مکہ و مدینہ کی خدمت و حفاظت کے قابل ہو گئے! — ضد اور غصہ میں انسان کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے! — بہر حال اپنی لاٹھیوں اور لٹھ بندوں کو چیرتے ہوئے اور ان کے درمیان گھستے چلتے! ہم لوگ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے "مولانا عبدالباری صاحبؒ خود تشریف فرما نہ تھے۔ باقی اُن کے خاندان کے دوسرے ذمہ دار حضرات سب موجود، نیز اس پارٹی کے دوسرے اکابر موافقین و مخالفین کو ملا کر مجمع عظیم الشان، علی برادران اسٹیج پر بیٹھ لئے تو مولانا ظفر الملک نے بہ حیثیت داعی جلسہ پکار کر کہا، کہ "ہم لوگ جلسہ کرنیکو تیار ہیں۔ اور میں داعیان جلسہ کی طرف سے حفظ امن کا بھی ذمہ لیتا ہوں، اب فریق مخالف کے لیڈر، مولانا حسرت موہانی اور مشیر حسین صاحب قدوائی اسی طرح کا وعدہ کریں، کہ ان کے فریق کی طرف سے نقض امن نہ ہوگا" اس پر دونوں صاحب صاف نکل گئے اور — یہ عجیب قسم کا احساس ذمہ داری تھا — لگے کہنے کہ ہم کوئی ذمہ داری نہیں لیتے" مولوی ظفر الملک صاحب نے دیکھا کہ وہ فریق فساد پر آمادہ ہو کر آیا ہے اور اس کے اکابر قیام امن کی طرف سے کانوں پر ہاتھ دہر رہے ہیں، تو مجبوراً اعلان کیا کہ جلسہ ملتوی کیا جاتا ہے! — جلسہ برخاست ہو گیا۔ لیکن عامہ مسلمین کے دلوں میں شورش پسندوں کی طرف سے بیزاری و نفرت کی جو لہر دوڑ گئی، اس کا دور کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی اور اب "پاسیانہ" خدمت حرمین

کا دوبارہ مظاہرہ لکھنؤ شہر میں ممکن نہ رہا۔

محمد علیؒ کی فراست غضب کی تھی، اور کام کرنے کا جذبہ بے پناہ۔ آنکھا رنگ دیکھ کر سمجھ گئے کہ اصلی ضد اور کد جو ہے وہ مقامی کارکنوں سے ہے نہ کہ خود اُن سے شوکت صاحب کی قوت عمل کچھ اُن سے بھی بڑھ کر تیز، گھر پہونچتے پہونچتے یہ فیصلہ کرلیا، کہ جلسہ دوسرے دن پھر ہو، اور داعی وہ جلسہ لکھنؤ کے کارکن نہیں، بلکہ شوکت علی صاحب خود طلب کریں۔ اور صدر جلسہ بھی کوئی غیر جانبدار شخص ہو، میں جلسہ کے بعد جلسہ گاہ کے باہر اور امین الدولہ پارک میں لوگوں سے ملنے ملانے ٹھہر گیا تھا۔ یہ کیا خبر تھی۔ کہ اتنی سی دیر میں اُدھر یہ فیصلے ہو جائیں گے۔ بعد مغرب گھر جا رہا تھا۔ کہ راستہ میں ایک صاحب مطبع ملے۔ کل کے جلسہ کا اشتہار چھاپنے لئے جا رہے تھے، مقام جلسہ وہیں امین آباد میں ممتاز حسین مرحوم بیرسٹر کا لق و دق مکان بالکل ٹھیک، داعی جلسہ مولانا شوکت علی، یہ بھی ٹھیک لیکن صدر جلسہ؟ حیرت کی آنکھوں سے دیکھا، اور استعجاب کی عینک سے پڑھا کہ یہ گمنام! مانا کہ یہ گمنام، گمنام ہی تھا، خلیق صاحب اور ظفر الملک صاحب کے برابر "بدنام" نہ تھا، پھر بھی کہاں اتنے اہم جلسہ کی صدارت کا بار گراں اور کہاں اپنا دوش ناتواں! بڑی خیر یہ ہوئی کہ اشتہار چھپنے سے قبل ہی خبر ہوگئی۔ جوں توں اُن صاحب مطبع کو تو روکا کہ خدا کے لئے یہ اشتہار فی الفور چھاپ نہ دیجئے گا۔ اور اُدھر بجائے گھر جانے کے دوڑا ہوا، شوکت صاحب کی خدمت میں پہونچا، اور عرض کیا کہ "ایک ادنیٰ سپاہی کو دفعتہً جرنل کے مرتبہ پر تو نہ پہونچا دیجئے باقی اگر حکم ہی ہے تو بڑی چھوٹی جو بھی ڈیوٹی لگا دی جائے گی۔ انشاء اللہ اُس سے نافرمانی نہ ہوگی"۔ بارے شوکت صاحب کو رحم آگیا۔ حکم ہوا، کوئی اور نام پیش کرو۔ اس میں کیا دشواری تھی۔ سید ظہور احمد صاحب پرانے وکیل اور قومی کارکن اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری کا نام معاً پیش ہوا، اور منظور ہوگیا۔ غرض بات کی بات میں دوسری شام کا جلسہ طے پاگیا۔ اور اشتہارات رات میں چھپ چھپا گئے۔

۹ر کی صبح ہوئی۔ اور راجہ نواب علیخان، مع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کے۔ علی برادران سے ملنے آئے۔ خلاصہ گفتگو یہ تھا کہ "ہمیں آپ سے اختلاف نہیں ہم تو صرف یہ دیکھانا چاہتے تھے۔ کہ آپ کے یہ لکھنوی دوست ہم لوگوں کو نکال کر لکھنو میں جلسہ نہیں کر سکتے۔ اب مولانا شوکت علی جلسہ طلب کر رہے ہیں، شوق سے کریں۔ اس میں ہم خلل انداز نہ ہونگے۔ بلکہ وہ جلسہ تو بعد مغرب ہے۔ ہم اپنا ایک جلسہ وکٹوریہ پارک میں بعد ظہر کئے دیتے ہیں، آپ وہاں آکر تقریر کریں، ہم سب آپ کی تقریر کو سنیں گے،" شوکت علی صاحب نے کہا کہ "میرا اصول تو آپ لوگوں کو معلوم ہے میں مخالفین کے جلسہ میں بدمزگی پیدا کرنے کو نہیں جاتا۔" لیکن محمدؐ علی بولے کہ "میرا یہ اصول نہیں کہ میں تو مخالفین ہی کے جلسہ میں شوق کے ساتھ جاتا ہوں۔ کہ مخالفین ہی کی تبلیغ کروں عین سنت رسول اللہ ہے۔ حضور ابوجہل کے مجمع کو جا جاکر اپنا پیام سناتے تھے، ابوبکرؓ کو اس کی حاجت نہ تھی۔" ——— کیا ظرف تھا "خود بین"، و "خود پرست" محمد علیؒ کا! محمدؐ علی نے معتقدین سے واہ واہ لینے والی تقریر میرے علم میں کبھی کی ہی نہیں! ولولہ جب اُنھیں پیدا ہوتا تھا، تو منکروں پر تبلیغ کا گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا، اور اپنے حق پر ہونے کا اس درجہ اعتماد ووثوق رہتا تھا کہ مخالفین کے ہجوم وکثرت سے گھبرائے بھی نہیں۔ کہتے تھے کہ پبلک سے ڈرنا کیا معنی۔ جس کے دل میں پبلک کا خوف بیٹھا ہوا ہے۔ اور جو پبلک سے بدگمان ہے اُس کی جمہوریت (ڈیماکریسی) جھوٹی جمہوریت ہے، اور وہ لیڈری کا کسی طرح اہل ہی نہیں ——— اُدھر راجہ نواب علیخان اٹھ کر گئے۔ اور ادھر خلیق صاحب نے برسنا شروع کرنا، کہ ان لوگوں کے جلسہ میں جاکر آپ ہماری شدید توہین کر رہے ہیں محمدؐ علیؒ جس بلند سطح پر تھے وہ نہ مخالفین کے سمجھ میں آتی، نہ موافقین کے! گھوم پھر کے سوال ان سب کے نظر میں وہی ذاتی توہین وتحقیر ہی کا رہتا، محمدؐ علیؒ لاکھ لاکھ اپنے زاویہ نظر کی توضیح کر رہے ہیں۔ یہاں پارٹی والے کب سمجھتے تھے، اتنے میں معلوم ہوا کہ راجہ نواب علیخان نے اعلان جلسۂ عام کا کیا ہے۔ محمدؐ علیؒ نے لکھ بھیجا کہ "میرا وعدہ

آپ کے جلسہ میں مخالفین کے جلسہ میں خدام الحرمین کے جلسہ میں آنے کا تھا، آپ نے اُسے جلسہ عام بنا دیا۔ میں آپ کے طلب کئے ہوئے جلسہ عام میں نہیں آ سکتا" خیر خلیق صاحب اور پارٹی والوں کے آنسو پچھے گئے۔ اور بات رہ گئی۔

صبح کا وقت ہے، میں خلیق صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا ہوں، کہ مخالف کیمپ والوں کے خاندان کے ایک نوعمر صاحبزادے آئے۔ صاحبزادہ خود بھی مولانا عبدالباری صاحبؒ کے شدید مخالف، اور اُن کے ایک مرحوم بزرگ کا روزنامچہ جو مولانا کے عزیز قریب تھے، اور اپنی آخر عمر میں اُن کے شدید مخالف! روزنامچہ میں وہ ساری باتیں درج، جو ایک "گھر کے بھیدی" کے سینے میں کسی گھر کے بھید دل" سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور پھر روزنامچہ کی نقل نہیں، اصل انھیں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا! اس سے بڑھ کر "نعمت غیر مترقبہ" اُس وقت اور کیا ہاتھ آ سکتی تھی۔ جو صاحبزادہ لائے تھے، وہ چاہتے تو منہ مانگے دام بھی پارٹی والوں سے وصول کر لیتے۔ مخالفوں کے سردار کی مخالفت کے لئے اس سے بہتر مصالحہ کہاں سے ہاتھ آتا؟ کوئی ایک حربہ نہیں پورے کا پورا میگزین ہاتھ آ رہا تھا! کون حریف اس موقع کو چھوڑتا؟ دنیا میں جنگ و مناظرہ کے وقت جو ذہنیت ساری دنیا کی ہو جایا کرتی ہے۔ اُس کے معیار سے دیکھئے، تو کون اتنے بڑے شکار کو ہاتھ سے جانے دیتا؟ بڑے بڑے لیڈر اور اڈیٹر اچھے اچھے مولوی اور مشائخ، ایسے موقعوں پر کیا کیا کرتے ہیں؟ لوگ لپک لپک کر بڑے اور لگے اُن صاحبزادہ کو حلقہ میں لیکر، مزہ لے لیکر روزنامچہ کو پڑھنے، کوئی بیٹھا اور کوئی کھڑے ہی کھڑے! سارے مجمع میں صرف ایک شخص ایسا تھا۔ جو مجمع سے ہٹا ہوا، پہلے تو اس "تماشہ" کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا، قریب آیا۔ اور شوق و مسرت کے بجائے، ناگواری کے لہجہ میں بولا "یہ کیا واہیات ہے! اختلاف جو کچھ ہے، قومی معاملات میں ہے، ذاتیات اور خانگی نزاعات کی راہ نہیں کھل گئی ہے۔

اس شخص کو آپ نے پہچانا؟ یہ محمد علیؒ تھا۔ وہی محمد علیؒ جس کے غصہ ور ہونے کی

خود بین و خود نما ہونے کی۔ جنگ پسند ہونے کی، داستانیں خدا جانے کتنی آپ سن چکے ہونگے! انسان کا اصلی ظرف، مخالفت اور شدید مخالفت ہی کے وقت کھلتا ہے جب تک دوستی و موافقت ہے ہر عیب ہنر ہے۔ ادھر مخالفت پیدا ہوئی، ادھر ہنر عیب بن گیا۔ اور پھر ہمارے اخبار نویس تو بلا مخالفت شدید کے بھی ایسے نادر موقعوں کی ٹوہ ہی میں رہا کرتے ہیں، اور اس کا شمار اپنی صحافت کے کمالات میں کرتے ہیں۔ کہ آج اسے ننگا کر دیا۔ کل اس کی پگڑی اچھالدی، پرسوں کسی اور کی رسوائیاں مزے لے لے کر چھاپ ڈالیں!

فرنگی محل کا کچا چٹھا" دوسروں کے علاوہ خود اس ڈائری نویس کی سازش سے ہزاروں کی تعداد میں طبع ہو کر شائع ہو رہا ہے، باہر کے اکثر اخبارات میں نکل چکا ہے لیکن محمد علی کے اخبار ہمدرد میں ابتک نہیں نکلا لکھنو کا پریس تو اپنے ہاتھ میں تھا نہیں خیر اس کی طرف سے تو صبر تھا۔ لیکن ہمدرد میں نہ نکلنے کے کیا معنی؟ کہیں اور چھپتا نہ چھپتا، ہمدرد میں تو اسے سب سے پہلا نکلنا تھا۔ عارف صاحب ہمدرد کے انچارج ایڈیٹر) لکھنو میں محمد علی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک صبح میں خلیق صاحب کے ہاں آیا۔" چٹھے" کے مصنف صاحب سے ملے تو کہا کہ" ہمدرد میں چھپنے کے لئے میں نے عارف صاحب کو دیا تھا۔ عارف صاحب نے کہا کہ محمد علی صاحب سے پوچھ لوں، مولانا نے اجازت نہ دی۔ اب آپ کہئے"۔ میں نے دل میں کہا کہ اجازت نہ دینے کے کیا معنی؟ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی۔ کہ جنگ میں غنیم کے گولے تو ہمارے سروں پر آکر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں، اور ہم ہیں کہ اپنی سب سے بڑی توپ کے دہانے پر مہر لگاتے ہوئے ہیں! ——— عوام" کی نظر میں یہ ساری جنگ، بجز فرنگی محل اور محمد علی کی جنگ کے اور تھی کیا؟ اور" خواص" کیا اس باب میں عوام سے ممتاز تھے؟ ——— جی کڑا کر کے عرض کی کہنے کی دیر تھی کہ ایک زبردست ڈانٹ ڈپٹ، اور تنہائی میں نہیں، پارٹی والوں کے روبرو، گرجتی ہوئی آواز میں اس قسم کے

فقرے سنائی دیئے۔ ہرگز نہیں چھپ سکتا۔ میرے اخبار میں اور ایسی لغو چیزیں!
یہ ہرگز صحیح اور شریفانہ صحافت نہیں ہے۔ یہ طریقے چنتامنی ایڈیٹر لیڈر کے ہیں،
یہ چنتامنی کا طرز تم کہاں سے سیکھ رہے ہو! یہ کہا اور "چٹھا" میرے ہاتھ سے
لے، پرزہ پرزہ کرڈالا! میں لاکھ معتقد اور شیدائی سہی، بہر حال ایک زندہ نفس
رکھتا تھا۔ اور نفس کسی مجمع میں اپنی خواری کب برداشت کرسکتا ہے۔ اس "توہین"
کو نہ برداشت کرسکا۔ لیکن کرتا کیا۔ بس دل ہی دل میں جھنجھلاتا، اور غصہ کرتا رہا،
کہ انکا دوست بھی خراب اور دشمن تو خراب ہے ہی۔ یہی مزاج ہے جبھی تو ان کا کوئی
دوست رہا نہیں۔ یہاں تو ان کے واسطے مٹے جاتے ہیں۔ اور یہ ہیں کہ نہ کسی کی عزت
کا خیال کریں، نہ جذبات کا! کچھ دیر روٹھا اُن سے الگ بیٹھا رہا۔ اتنے میں کھانے
کا وقت آیا سب اٹھے میں چپ بیٹھا رہا۔ خود ہی بولے، اٹھو کھانا پچھ گیا۔ میں نے
کہا "بھوک نہیں ہے" اٹھ کر پاس آئے، گلے لگا لیا اور بولے "واہ بس اتنے
میں خفا ہوگئے" لوٹے میں پانی لے کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ "لو میں خود تمھارے
ہاتھ دھلاتا ہوں، تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤنگا، طبیعت جز بز تو بہت ہوئی
لیکن پھر وہی کہ کرتا کیا۔ آخر اپنی ہار ماننی ہی پڑی ——— یہ چھوٹے چھوٹے واقعات
روزمرہ کی زندگی کے، کسی کو گراں گزریں تو گزریں۔ لیکن میرے نزدیک تو محمد علیؒ کی
(اور ایک انھیں کی کیا، ہر) شخصیت کے ماپنے کا یہی اصلی پیمانہ ہے سیرت پر کردار
پر باطن پر، سرشت پر اگر ان واقعات سے بھی روشنی نہ پڑے گی تو آخر اور کہاں سے
واقعات لائے جائیں گے؟

---

۹ کی شام خدا خدا کرکے آئی۔ جلسہ گاہ پر ہمارے رضا کاروں کا پہرہ
بہت قبل سے تھا۔ لاٹھیاں اور چھڑیاں سب سے باہر ہی رکھوالی جاتی تھیں،
بعد مغرب مجمع خوب کھچا کھچ ہوگیا۔ اور جلسہ کی کارروائی امن و اطمینان سے شروع ہوئی
پہلے قریب ایک گھنٹہ کے مولانا شوکت علی بولے پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو گھنٹے محمد علیؒ

تقریر تھی کیا؟ کیا اپنے اوپر جو مسلسل و دل آزار حملے مہینوں سے جاری تھے، ان کا کوئی جواب؟ حریفوں پر کوئی جوابی حملہ قبہ نوازی کی رد میں، قبہ شکنی کی حمایت "؟ وہابیت" کی حوصلہ افزائی؟" ابن سعود کے مناقب و فضائل؟" بدعات کا رد؟ لوگ کہتے اور صحیح کہتے ہیں، کہ محمد علی جذبات کے پتلے تھے، وہ" جذباتی "بے شبہ تھے، لیکن عقلی " استدلالی" بھی اسی قدر تھے جب جذبات کا دریا زوروں پر ہوتا. تو سب کو اپنے ساتھ بہا لیجاتا۔ جب استدلال پر آتے تو گرفتیں ایسی کرتے، کہ اچھے اچھے وکیلوں بیرسٹروں منطقیوں کو رشک آ جاتا۔ آج کی تقریر تمامتر سنجیدہ، ٹھوس، مدلل، و معقول تھی (گو خشک تو ان کی کوئی تقریر ہو ہی نہ سکتی تھی) بس جمعیت خلافت اور رسلہ حجاز میں اس کی روش و مسلک کی تائید میں، ایک مفصل و مکمل بیان۔ شروع سے ایک ایک واقعہ کو گنا کر۔ جزئیات کی تفصیل میں جا جا کر حاضرین سے اس قسم کے سوال کرتے جاتے تھے، کہ واقعات حجاز پر پردہ کون ڈالنا چاہتا ہے، خلافت کمیٹی جس نے مدتوں قبل، دسمبر ۲۴ء میں اپنا خاص وفد تحقیق حال کے لئے روانہ کیا۔ یا شریف علی جس نے جدہ ہی میں اس وفد کو روک کر واقعات پر پردہ ڈالنا چاہا؟ اسی طرح ایک ایک چیز کو دہرا کر آخر میں پوچھا، کہ کوئی ایک بات بھی ایسی بتائیے، جو خلافت کمیٹی کے کرنے کی تھی، اور اس نے نہیں کی، یا ایک ہی ایسی بات جو اُسے نہ کرنی چاہئے تھی۔ اور اس نے کر ڈالی؟

سارے مجمع پر کامل سکوت کی کیفیت۔ فرنگی محل کے متعدد اصحاب شریک تھے سب اُسی طرح سُن رہے تھے، کسی ایک کو نہ اپنے عقائد کے خلاف نہ اپنی ذات کے خلاف نہ اپنے خاندان کے خلاف کوئی تلخی محسوس ہوئی۔ آخر میں مولانا حسرت موہانی کھڑے ہوئے۔ اور فرمایا کہ مجھے دونوں بھائیوں کی تقریر سے کامل اتفاق ہے؟ ——

یہ تھی اُس "وہابی" و قبہ شکن محمد علی کی وہ ہولناک و مہیب تقریر، جسے "شریفی حضرات خدا معلوم کن کن غیر شریفانہ طریقوں پر لکھنو میں روک رہے تھے! محمد علیؒ اتنا وقت بھی کن مشکلوں سے نکال کر آئے تھے۔ دوسرے دن روانہ ہو گئے، لکھنو میں جلسے اس کے بعد بھی برابر دو دن اور ہوتے رہے۔ جن میں مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء

کے دونوں مولوی صاحبان کی تقریریں ہوئیں۔ محمدؐ علی کے ڈائری نویس کو اُن سے تعلق نہیں ــــــــ محمدؐ علی اور ہم لوگوں میں ایک بڑا فرق یہ تھا، کہ ہماری نظریں چھوٹے چھوٹے مسائل تک محدود، اور انھیں میں الجھ الجھ کر رہ جاتیں، اور انھیں جزئیات کے اوپر ہمارے ہاں پارٹیاں، اور پھر پارٹیوں کے اندر پارٹیاں بنجاتیں، محمدؐ علی رحمۃ کی نظر کہیں زیادہ بلند و عمیق، ان جزئیات سے ہمیشہ بالاتر رہتی۔ یہی سبب ہے کہ وہ خود نہ کوئی پارٹی بنا سکے، نہ کسی بنی بنائی پارٹی میں عرصہ تک بناہ سکے۔ ہر شخص محمدؐ علی رحمۃ کو اپنی پارٹی میں کھینچنے کا آرزومند، ہر پارٹی اس کوہ پیکر کو اپنے میں ملا لینے کی حریص لیکن وہ خود ہر پارٹی سے اور قومی معاملات میں ہر دوستی سے بلند تر، محض حق کا طالب اور حق کا ساتھی تھا۔ جس کو اس نے حق سمجھ لیا۔ بس اس کا ساتھی ہو گیا، پھر چاہے اُس میں سب ہی کا ساتھ چھوڑ دینا پڑے، حق کے معاملہ میں نہ کسی دوست کی پروا، نہ عزیز کی، نہ اپنے محسن کی نہ اپنے مرشد کی۔ لیکن حدود کا لحاظ یہاں بھی اشتعالِ جذبات کا موقع اس سے بڑھ کر اور کون سا ہوگا؟ بڑے بڑے متین اور ضبط رکھنے والے بھی ایسے موقعوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ یہ ظرف محمدؐ علی ہی کا تھا کہ اس حال میں بھی حدود کو محفوظ رکھا اور اپنی ذات سے ایک بات بھی ایسی نہ ہونے دی۔ جس پر آج اُن جذبات کے ٹھنڈے پڑ جانے اور آٹھ سال گزر جانے پر ڈائری نویس کو کوئی ندامت محسوس ہو۔

۲۳/ دسمبر ۱۹۲۵ء۔ شام کا وقت ہے۔ کانپور میں کانگرس اور خلافت کانفرنس دونوں کے سالانہ اجلاس ہو رہے ہیں۔ دونوں کے کیمپ مل کر ایک پورا نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔ ہزارہا ہزار کا مجمع۔ خیموں کا یہاں سے وہاں تک ایک جنگل کا جنگل ایک پختہ عمارت میں صدر خلافت، مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے اکابر ٹھہرے ہوئے۔ اسی کے ایک کمرے میں خلافت کی مرکزی کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ اور سب سے زیادہ معرکتہ الآرا مسئلہ مجلس کے سامنے زور و شور سے یہ چھڑا ہوا ہے کہ صوبہ اودھ کی

اودھ خلافت کمیٹیوں میں سے جائز اور مستند کمیٹی کون ہے اور کسکے نمائندے مرکزی مجلس میں باریابی کے قابل ہیں، دو
کمیٹیاں کیسی تو — فرنگی محل کی سرگرمیاں "پاسبانہ" "خدمت حرمین" کے مظاہرہ کے بعد کچھ ختم تھوڑے
رہی ہوگئی تھیں، سعودی شریفی جنگ اسی ہماہمی کیساتھ جاری تھی، اور قبہ نوازی اور قبہ شکنی دونوں
کے مورچے۔ اسی شدت وحدت کیساتھ گولہ باری اور آتش افشانی میں مصروف
تحریریں، تقریریں، مناظرے، اور مناظرہ کے چیلنج، پوسٹر، اشتہارات، پمفلٹ، اور ردِ
پمفلٹ سوال، جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ اسی شدومد سے قائم، صوبۂ اودھ
کی جو خلافت کمیٹی تھی۔ اس کے صدر و ناظم دونوں فرنگی محلی۔ اور قدرتاً اپنے خیالات
کی اشاعت میں جوش کے ساتھ سرگرم۔ اب یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ اُدھر آل انڈیا
مرکزی جمعیت خلافت تو سلطان ابن سعود کی حامی وہمدرد اور ادھر اس کی اس
صوبہ وار شاخ کے ذمہ دار ارکان، سلطان کی مخالفت پر آمادہ، اور خود جمعیت مرکزی
سے بغاوت پر کمربستہ۔ مولوی ظفر الملک صاحب ایسے موقع پر کب چوک جانیوالے
تھے، قواعد وضوابط سے پورے طرح لیس، اور آئین وقانون سے مسلح، انھوں نے
نومبر ہی میں جھٹ ایک دوسری اودھ خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈال دی تھی، اور
اخبارات میں اس کا اعلان قبل سے کرا کر، بارہ بنکی میں اس کا باضابطہ انعقاد
بھی کر ڈالا تھا۔ روح رواں تو وہ خود، اور چودھری خلیق الزمان تھے، نام کیلئے صدارت
اس ڈائری نویس کے ذمہ ڈال دی گئی۔ اُدھر وہ قدیم فرنگی محلی کمیٹی بھی بہر حال
موجود تھی۔ مرکزی کے سامنے سب سے پہلا اور اہم مسئلہ یہی پیش ہوا کہ صوبۂ اودھ
کی ذمہ دار اور حقیقی کمیٹی وہ کس کو تسلیم کرے۔

مولانا شوکت علی نے بحیثیت ناظم مرکزی، تحریک پیش کی، کہ قدیم کمیٹی کا
الحاق توڑ کر جدید کا الحاق منظور کیا جائے۔ بحث شروع ہوئی، قدیم کمیٹی کے صدر و ناظم دونوں
جلسہ میں موجود تھے۔ بس دو صاحب وہ، اور تیسرے مولانا حسرت موہانی اور چوتھے ایک صاحب
اور غالباً صوبۂ متوسط کے، بس ان چار شخصوں کو چھوڑ کر جلسے کا جلسہ شوکت صاحب کی تائید میں تھا۔ ڈاکٹر سید محمود

مولانا عبدالقادر قصوری۔ غازی عبدالرحمٰن (امرتسری) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سیٹھ یعقوب حسن (مدراس) مولانا داؤد غزنوی، مسٹر آصف علی، قمر احمد صاحب (ایڈیٹر خلافت) عارف ہسوی صاحب وغیرہ وغیرہ کثرت سے حضرات نے اپنی تقریروں میں یہی کہا۔ اور مولوی ظفر الملک صاحب علوی، خلیق الزمان نے جدید کمیٹی کے نمایندوں کی حیثیت سے مؤثر بیانات دیئے۔ —— جلسہ کی کارروائی بجائے خود کتنی ہی دلچسپ سہی۔ لیکن آخر محمد علیؒ کا ڈائری نویس ان صفحات میں اس کے لئے گنجائش کہاں سے نکالے —— سب کو انتظار اور اشتیاق محمد علیؒ کی تقریر کا تھا۔ ہم سب کو توقع کیا معنی یقین ہی یہ تھا، کہ محمد علی کی تقریر خاص طور پر زور دار پرجوش ہوگی، اور قدیم کمیٹی والوں کا تار تار الگ الگ کرکے رکھدیگی۔ لیجئے تقریر شروع ہوئی اور ہم سب ہمہ تن گوش، کہ دل کی حسرتیں اب پوری ہو کر رہتی ہیں۔ اور محمد علیؒ کی زبان مخالفین میں سے ایک ایک کی قلعی کھول کر رکھتی ہے۔ لیکن یہ کیا؟ دو منٹ، چار منٹ، پانچ منٹ تقریر کے ہوگئے۔ اور نہ وہ آتش بیانی نہ شعلہ افشانی، نہ اس پر اصرار کے میرے ان دشمنوں کو فوراً نکال دیا جائے نہ اس کا مطالبہ کہ میرے، ان دوستوں کو فوراً لے لیا جائے۔ ایک معتدل سی تقریر، جو جذبات کو بھڑکانے والی نہیں دھیمی کرنیوالی تھی۔ اور جس کا خلاصہ یہ تھا، کہ قدیم کمیٹی کا الحاق توڑنا لازمی نہیں۔ اگر کوئی صورت اصلاح حال کی نکل آئے۔ تو ان لوگوں کی بھی ممبری بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ ہمارے فریق کے اہل غلو —— اور دونوں فریقوں میں سے کون فرد غلو سے خالی تھا؟ —— دنگ و متحیر، کہ لیجئے، جن کے واسطے یہ سب کچھ کیا گیا تھا، وہ خود ہی اس قدر ٹھنڈے ہوئے نکلے! اسقدر حیثیت گواہوں کے گزرنے کے بعد کوئی مدعی کا ہیکو یوں کہیں سست ثابت ہوا ہوگا! قدیم کمیٹی کی قسمت کا فیصلہ جو ہونا تھا، وہ تو بالآخر ہو ہی کر رہا۔ لیکن محمد علی کے یہ الفاظ اس وقت مخالفت کے جوش میں (اب یہ صحیح طور پر یاد نہیں کہ جلسہ کے اندر کہے تھے یا جلسہ کے باہر) بار بار دل میں کھٹکتے رہے کہ الحاق توڑ دینا صحیح طریق عمل نہیں، آئینی کارروائی یہ تھی کہ ان

لوگوں کو خود کمیٹی کے اندر (   ) کیا جاتا (یعنی ووٹوں کی کثرت سے شکست دیجاتی) اس اشتعال کے عالم میں عدل و ضابطہ کو اتنا ملحوظ رکھنے، ان آنکھوں نے تو صرف محمد علی کو دیکھا، دنیا تو اس سے خفیف تر موقعوں پر ہر ممکن حیلہ اور بہانہ سے بس مخالف کو شکست دیدینا جانتی ہے؟

محمد علی تقریر کر رہے تھے کہ اثنائے تقریر میں کہیں یہ فقرہ ان کی زبان سے نکل گیا۔

"یہ خلافت کا کام قوم کا کام ہے۔ ملت کی خدمت ہے، کوئی موروثی گدی نشین نہیں ہے۔ جو لوگ اس کے کام کے لئے تیار و مستعد ہوں وہی اس میں رہیں۔ باقی جو مادہ فاسد اس میں گھس آیا ہے۔ اُسے خارج ہی ہو جانا چاہیئے"

یہ فقرہ سننا تھا کہ خاندان فرنگی محل کے ایک ہونہار چشم و چراغ، قدیم اودھ خلافت کمیٹی کے صدر اور مولانا عبدالباری مرحوم و مغفور کے قریب ترین عزیز تڑپ کر اٹھے۔ اور سر جلسہ یہ کہتے ہوئے۔ ع اپنے ایک کھدر پوش متوسل کے جنکا ذکر اکتوبر کے جلسۂ لکھنؤ میں آچکا ہے، باہر چلے گئے۔

آپ ہمیں مادۂ فاسد کہتے ہیں، ہم آپ کو پیکر باطل سمجھتے ہیں

یہ لکھنؤ: تھا، کانپور تھا۔ مجمع فرنگی محل کے معتقدین کا نہ تھا۔ جلسہ مرکزی خلافت کا تھا۔ ارکان کی بہت بڑی تعداد اس وقت فرنگی محل کی طرف سے بھری بیٹھی تھی کتنوں کے چہرہ غصہ سے تمتما اٹھے، کتنوں نے چاہا کہ فوراً ایک ملامت کا ووٹ پاس کرا دیں، اور یہ تو سب ہی سمجھے کہ اب فرنگی محل کی خیر نہیں، محمد علی کی زبان پشتہا پشت کی خبر لے ڈالیگی! ——— لیکن ہوا کیا؟ محمد علی کی زبان سے صرف یہ لفظ، غصہ کی تلملاہٹ کے ساتھ نکلے "کہ آپ بچے ہیں بچے ہیں" اور اس دو حرفی جواب کے بعد تقریر اُسی اعتدال و توازن کے ساتھ جوں کی توں جاری! یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی

ناگوار واشتعال انگیز واقعہ پیش آیا بھی ہے! ــــــ محمد علی کے "غصہ کرنے" کے بہت سے واقعات آپ نے سنے ہونگے، اور وہ صحیح بھی ہونگے، بہتر ہوگا کہ "غصہ سہنے" کی بھی اس مثال کو اپنی یادداشت میں ٹانک لیجئے۔ محمد علی تو خیر واقعی غصہ ور تھے، لیکن کوئی حلیم سا حلیم انسان بھی ہوتا۔ تو اس موقع پر کیا کرتا؟ کیا محمد علی سے زیادہ حلم و تحمل کا کوئی ثبوت دیتا؟ جلسہ کے بعد اور جلسہ کے باہر جدید و قدیم اودھ خلافت کمیٹیوں کے ارکان میں باہم اکثر زور آزمائی ہوتی رہی۔ اور قدیم کمیٹی چونکہ کمزور تھی، اپنی کمزوری کے نتائج بھی اس کو اٹھانا پڑا کئے۔ لیکن محمد علی کو ایک مرتبہ بھی ان آویزشوں میں پڑتے میں نے نہیں دیکھا۔

اس ڈائری نویس کا پنور ۲۲ر کی شام ہی کو پہونچ گیا تھا۔ نیا نیا صدر صوبہ کمیٹی تھا۔ خوب خوب خاطریں ہوئیں، اور بجائے خادم کے مخدوم بنا رہا۔ دوسرے دن صبح کو محمد علی آگئے۔ چند ہی روز قبل کمریڈ میں اُن کے قلم سے ایک انگریز سیولین کا طویل مکتوب ہندوستان سے ایک دوسرے انگریز سیولین کے نام انگلستان میں نکلا تھا۔ مضمون کئی کالموں میں تھا، اور محمد علی کے بہترین مضامین میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ یہ شاید پہلے کہیں عرض کیا جا چکا ہے، کہ محمد علی اصلی اہل قلم انگریزی کے تھے، نہ کہ اردو کے، ساری مشق ان کی انگریزی انشاء پردازی کی تھی۔ زبان اور خیالات دونوں کا پورا لطف انکی انگریزی تحریریں پڑھنے میں تھا۔ ملنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے اس مضمون کی میں نے دل کھول کر داد دی۔ زنانہ اُن کے ہمراہ بھی تھا۔ اور میرے بھی۔ خود جس خیمہ میں ٹھہرے تھے، اُسی کے متصل ایک خیمہ مجھے بھی ملا۔ محمد علی بیحد مشغول تھے، کانگرس کی صدارت کو ابھی ایک ہی سال گزرا تھا۔ کانگرس والے بے طرح چمٹے ہوئے۔ اور خلافت کے تو سب ہی کچھ وہ تھے۔ وہی مرتبہ حاصل، جو بارات میں نوشہ کو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی بڑی اور خدا معلوم کتنی کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ بہتوں کے کارکن انھیں گھیرے ہوئے۔ خیمہ متصل نہ ہوتا۔ تو مجھے باریابی بھی مشکل ہوتی۔ مگر اس قرب و ہمسائیگی نے مشکل آسان کر دی۔ ہر وقت کے خلا ملا کا موقع حاصل کانگرس کا اجلاس،

مسز نائیڈو کی صدارت میں بڑے معرکہ کا اجلاس تھا۔ ہزارہا کا مجمع، اس ڈائری نویس کے پاس ایک کی جگہ دو ٹکٹ موجود تھے۔ ایک بہ حیثیت ڈیلیگیٹ۔ لیکن یو پی کے ڈیلیگیٹوں کے لئے جو جگہ رکھی گئی تھی، وہ ڈائس سے بہت دور تھی۔ وہاں تک مقرروں کی آواز پہونچنی مشکل تھی۔ اتنی دور بیٹھنے کو طبیعت نہ چاہی۔ دوسرا ٹکٹ بہ حیثیت ایڈیٹر سچ کے تھا، پریس کے لئے جگہ بہت اچھی تھی، لیکن یہاں تقریبًا سب وہی لوگ تھے، جو اپنے اپنے اخبار کے لئے پنسل یا فاؤنٹن پن لئے بیٹھے برابر رپورٹیں لے رہے تھے، سچ کے ناکارہ ایڈیٹر کو ان کے درمیان خالی ہاتھ بیٹھتے بھی اچھا نہ معلوم ہوا۔ طبیعت اسی حیص بیص میں تھی، کہ محمد علی اپنے خیمہ میں آتے ہوئے دکھائی دیے۔ بہ حیثیت سابق صدر کانگرس متعدد اعزازی ٹکٹ ان کی خدمت میں نذر کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ٹکٹ بلا میری طلب کے میرے حوالہ کیا۔ اور اب میں ڈائس نشین تھا۔ کم خرچ بالانشین، سنا تھا۔ یہاں "بالانشینی" "کم خرچ" کے ساتھ نہیں، بلا خرچ مفت ہاتھ آگئی! ——— بغیر دوستوں کو ساتھ لئے کسی جلسہ میں دعوت میں، تماشہ، وعظ میں، لکچر میں، تنہا جانا، محمد علی کے مذہب میں گویا گناہ تھا۔ اور جس طرح وہ کھانا۔ بغیر دو چار شخصوں کو دسترخوان پر ساتھ بٹھائے تنہا نہیں کھا سکتے تھے، اسی طرح جس چیز سے بھی انھیں لطف آرہا ہو۔ اس سے دوستوں کو محروم رکھنا وہ جانتے ہی نہ تھے، فرمائش اور تقاضہ کا انتظار نہ کرتے، خود دوڑ دوڑ کر بلاتے اور گھسیٹ گھسیٹ کر لاتے!

خلافت کا ایک وفد، جس کے ارکان مولانا ظفر علیخان، مولانا عرفان اور شعیب قریشی صاحب تھے۔ آخر اکتوبر میں حجاز روانہ ہوا تھا۔ کانپور میں خلافت کے جلسے ہو رہے تھے، اور عین اُس وقت شاید مرکزی کا جلسہ ہو رہا تھا کہ وفد حجاز کا ایک طویل تار موصول ہوا۔ کہ سلطان نجد کا قبضہ مدینہ منورہ پر ہوگیا۔ اور شریفی فوجیں بھاگ نکلیں۔ یہ خبر ظاہر ہے کہ ہم سب کے لئے کتنی مسرت انگیز تھی۔ لیکن ساتھ ہی کوئی ایسی اطلاع بھی پہونچی (اتنے روز کے بعد اب یہ تفصیل ذہن میں نہیں

کہ کس ذریعہ سے) کہ سلطان نجد، خود شاہ حجاز ہو جانا چاہتے ہیں، اور شعیب قریشی اور مولانا عرفان کی مخالفت کے باوجود مولانا ظفر علیخان، سلطان کی ہمنوائی پر آمادہ ہیں۔ سقوط مدینہ کی خبر سے جو مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ جانی چاہئے تھے اُسے خبر کے اس جزو نے اداسی سے بدل دیا۔ لیکن یہ اداسی زیادہ تر محض محمد علی کی اداسی کا عکس تھی، ورنہ ہم عوام کی تو سمجھ میں آیا بھی نہیں۔ کہ آخر اس میں حزن وتاسف کی کیا بات ہے۔ تقریباً ہم سب ایک ہی آدھ فرد کو مستثنیٰ کر کے، ہم سب کے سب بس اسی قدر چاہتے تھے۔ کہ فتح سلطان کو حاصل ہو، اور شریفی حکومت وتسلط کے اعادہ کا امکان باقی نہ رہے۔ سلطان کے عقائد سے بھی اکثر افراد کو اتفاق ہی تھا۔ اور سلطان کی تائید کی کی قوی بنا یہی ہم عقیدگی تھی۔ محمد علیؒ کی افسردگی آج دیکھ کر پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ محمد علیؒ جو سلطان کی تائید کر رہے تھے اس سے بالذات سلطان کی یا ان کے عقائد کی تائید مقصود نہ تھی بلکہ اس کی بنیاد صرف یہ تھی۔ کہ اُن کے خیال میں سلطان، ملکیت وشخصیت کی بدعت کو مٹا کر، جمہوری وشوریٰ حکومت قائم کرنیوالے ہیں۔ اور ارض حجاز کی خدمت کا موقع اپنے ساتھ سارے عالم اسلام کو دینے والے ہیں۔ آج اس توقع کو دھکا پہونچ رہا تھا آج یہ امید ٹوٹ رہی تھی، اس کا صدمہ محمد علیؒ کو نہ ہوتا تو اور کس کو ہوتا؟

علیگڈھ کی جوبلی کا بھی عین یہی زمانہ تھا! صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم نے باوجود اپنی مسلسل علالت وضعف کے، علیگڈھ کالج کی پنجاہ سالہ سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منانے کا تہیہ کیا تھا۔ اور وہ جشن اسی زمانہ میں ہو رہا تھا؟ یونیورسٹی کا نوکیشن وغیرہ کے علاوہ مسلم لیگ کا جلسہ بھی وہیں تھا۔ محمد علی سے بڑھکر علیگڈھ کا شیدائی اور کون رہ چکا تھا! لیکن ساتھ ہی اس وقت سب سے زیادہ انھیں کا دل بھی علیگڈھ کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ چند سال قبل کا زمانہ ہوتا۔ تو جبلی میں وہی سب سے پیش پیش ہوتے۔ اس وقت علیگڈھ کا رخ کرتے ان کا دل دکھتا تھا۔ کالج کے درودیوار تک ان کے محبوب تھے، خاک علیگڈھ کے ذرہ ذرہ سے

انھیں شیفتگی تھی، گھر کا دروازہ اگر گھر کے مالک کی اولاد پر بند ہو جائے۔ تو وہ اولاد کیسی تڑپ تڑپ کر رہے گی۔ بس یہی حال محمدؐ علی کا تھا۔ لیکن ادائے فرض کا احساس بہر حال ہر شئے پر غالب تھا۔ مسلم لیگ کے جلسہ میں بڑے بڑے "سر" اور "خان بہادر" شریک ہو رہے تھے، اور مسلمانوں کے نام پر بڑے بڑے اہم فیصلے کئے جانیوالے تھے، اکثر کا خیال یہ بھی تھا کہ محمدؐ علی اسوقت کانگرس میں پھنسے ہیں۔ اس کی انھیں کہاں فرصت، کہ کانگرس چھوڑ کا نپور سے علیگڈھ دوڑے آئیں۔ اچھا ہے، وہ غائب ہی رہیں۔ یہاں جو جی میں آئیگا پاس کر لیا جائیگا۔ وقت کے وقت لوگوں نے محمدؐ علی کو توجہ دلائی کہ آپ مسلم لیگ میں نہ شریک ہوئے تو بڑا غضب ہو کر رہیگا۔ میں تو جلسہ خلافت کو ختم کر، اور کانگرس کے بھی دو ایک جلسوں میں شرکت کر کرا، کانپور سے سیدھا علیگڈھ، جلی کے باقی پروگرام میں شریک ہونے روانہ ہو گیا۔ محمدؐ علیؒ دو ایک وقت کے بعد خدا جانے کن کن مشکلوں سے اپنا پیچھا چھڑا، علیگڈھ پہونچے، آدھی رات کا وقت تھا، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سید محمود، اور اور کئی صاحب ساتھ تھے، میں عبد المجید خواجہ صاحب (مشہور بیرسٹر علیگڈھ، حال الہ آباد) کا مہمان تھا۔ وہیں یہ قافلہ بھی آیا، اور سب کو سوتے سے جگایا۔ سیاسی مجلسوں سے اس ڈائری نویسی کو زیادہ دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی۔ خلافت کمیٹی کی صورت ایک استثنائی تھی، مسلم لیگ کا نہ کبھی ممبر رہا۔ نہ کسی جلسہ میں تماشائی کی حیثیت سے ہی شریک ہوا۔ محمد علیؒ اپنے دو چار "احرار" رفیقوں کے جاتے تھے، واپسی پر اُن کی زبانی حالات سن لیتا تھا۔ چشمدید منظر صرف ایک ہے۔ جلسہ کے اندر نہیں جلسہ کے باہر۔ محمدؐ علیؒ، خواجہ صاحب کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ رات زیادہ آچکی ہے، دوسرے دن جلسہ صبح ہی سے ہے، رزلیوشن ابھی وقت تیار کرنے ہیں۔ "احرار" کی ساری پارٹی کا اصرار ہے کہ فلاں مسئلہ پر کل ایک لمبی تحریک پیش ہو، جس کے لئے کافی تیاری کی ضرورت تھی، محمدؐ علیؒ نے چاروں طرف دیکھا، کہ کوئی صاحب مسودہ تیار کر لیں کمرہ میں خاموشی رہی۔ پھر یہ کہا، کہ اچھا میں بولتا جاتا ہوں، کوئی صاحب لکھتے جائیں۔ متعدد "احرار" میں سے کوئی صاحب اس پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ آخر میں بمشکل آلہ آباد کے ایک

نوجوان بیرسٹر قلم ہاتھ میں لیکر بیٹھے اور لوگ تو جا جا کر سو رہے تھے، محمد علی غریب نے خدا معلوم کب تک جاگ کر کام ختم کیا ـــــــ یہ منظر اپنی نوعیت میں انوکھا نہ تھا، احرار، حضرات نام اپنی پارٹی کا چاہتے تھے، لیکن کام سارے کا سارا محمد علیؒ ہی سے لینا چاہتے تھے، محمد علی کی ذات گویا ایک مشین تھی جسے نہ آرام کی ضرورت اور نہ جسے کبھی کوئی معذوری پیش آسکتی تھی!

شریفی سعودی جنگ حجاز میں تو کہنا چاہئے کہ اب ختم ہو چکی تھی، البتہ ہندوستان میں برابر اُسی شدت اور اُسی حدت، اسی جوش اور اسی سرگرمی کے ساتھ تیغ و تفنگ سے نہ سہی زبان اور قلم سے جاری تھی، جنگ کے پہلو بیسیوں اور اطراف درجنوں تھے، لیکن اب سارے نزاعات سمٹ سمٹا کر صرف دو شخصیتوں کے دامن کے نیچے آگئے تھے، ایک طرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی، اور دوسری طرف محمد علیؒ دنیا جس جنگ کا تماشہ، مزہ لے لیکر دیکھ رہی تھی، وہ یہی "پیر و مرید" کی جنگ تھی۔ محمد علیؒ سے جس کسی کو دل کا بخار نکالنا ہوتا۔ جھٹ فرنگی محلی لشکر میں شریک ہو جاتا فرنگی محل کے درپے جو کوئی بھی ہوتا۔ معاً محمد علی کے جھنڈے کے نیچے آکھڑا ہوتا لیکن یہ خیال دنیا کا تھا، پارٹی والوں کا تھا، ممکن ہے فرنگی محلیوں کا ہو، خود محمد علی نے اب تک ایک دن کے لئے بھی اس جنگ کو نہ اس نقطۂ نظر سے دیکھا۔ نہ مولانا سے فرنگی محلیؒ کو اپنے حریف کے مقابل کی حیثیت سے دیکھا، اور نہ اپنے کو اپنے مرشد سے آمادہ جنگ پایا۔ محمد علی کا نقطۂ نظر ہی بالکل دوسرا تھا۔ تصریح کئی بار گزر چکی، دوہرایا کہاں تک جائے؟ جنگ اگست ۱۹۲۵ء میں شروع ہوئی تھی، اور اب جنوری ۱۹۲۶ء کا آغاز تھا۔ اس پانچ مہینے کے عرصہ میں کیسے کیسے انقلابات ہو گئے۔ کتنے کتنے اچھے دل برے ہو کر رہے کتنے جڑے ہوئے دل ٹوٹ ٹوٹ گئے دوست دشمن بن گئے۔ اور کتنے بھائی، بھائیوں کی عزت کے خواہاں ہو گئے! لیکن خود محمد علی کی زبان پر اب تک اپنے پیر و مرشد کے معاملہ میں مہر لگی ہوئی۔ لوگ چھیڑتے پوچھتے گدگداتے ہنسنے، طعنے دیتے، کہ اب تو کسی طرح مریدی مشتعل ہو کر

پیرکے مقابلہ میں بھپرے اور محمد علی کی زبان فرنگی محل پر کھلے، لیکن محمد علیؒ نے اپنی بیسیوں تقریروں اور (ان سے کم لیکن پھر بھی بہت) تحریروں میں ایک لفظ بھی ایسا نہ آنے دیا، جس سے مولانا کی توہین نکلتی ہو، ہمدرد میں کبھی اتفاق سے جب دوسروں کے قلم سے (اور ان دوسروں میں خود یہ ڈائری نویس اور عارف صاحب بھی شامل ہیں) کوئی چیز اس قسم کی نکل جاتی، تو علم ہونے پر محمد علی سخت ناخوش ہوتے، زبانی گفتگوؤں میں اس ڈائری نویس نے جب کبھی فرنگی محل کی زیادتیوں یا بد زبانیوں کی شکایت کرنی چاہی، تو ہمیشہ محمد علی نے یہ جرح کی کہ یہ الفاظ کس کے ہیں۔؟ خود مولانا کے ہیں؟ آپ نے اپنے کانوں سے انھیں کی زبان سے سنے ہیں۔؟ اور جب ان سوالات کے جواب میں حامی نہ بھری جا سکی، تو فرماتے "بس پھر مجھے پروا نہیں، کوئی کچھ بھی کہا کرے، میرا معاملہ تو صرف مولانا سے ہے کسی اور سے نہیں"۔ ہم لوگ پارٹی والے، جب آپس میں بیٹھتے، تو کہتے کہ "شوکت صاحب کی طرف سے تو اب اطمینان ہے، وہ تو فرنگی محل کو خوب پہچان گئے اب نہیں بدلنے کے، لیکن ان حضرت (محمد علیؒ) کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا، یہ جس وقت بھی پھر ادھر ڈھل جائیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں۔

ردولی میں سلسلۂ صابریہ کے مشہور بزرگ حضرت مخدوم شاہ عبدالحق کی درگاہ ایک مشہور و معروف درگاہ ہے۔ وسط جمادی الثانی میں عرس کی تقریب بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ اس سال عرس، دسمبر ۱۹۲۵ء کی بالکل آخری تاریخوں میں آکر پڑا، عارف ہسوی صاحب کا پنور تک تو آہی چکے تھے، وہاں سے اٹھے، تو سیدھے ردولی پہونچے، یہاں فرنگی محلی جماعت سے مڈبھیڑ ہوئی۔ جس میں خود مولانا مرحوم بھی شامل تھے، یہاں کیا کیا گزری، اس کا پورا حال تو اللہ ہی کو معلوم، البتہ عارف صاحب جب یہاں سے دفتر ہمدرد میں واپس پہونچے۔ تو فرنگی محل اور خصوصاً مولانا سے فرنگی محل کی شکایتوں کا طومار زبان پر بھی تھا۔ اور قلم پر بھی۔ چنانچہ ہمدرد میں ان کے قلم سے ہنایت مفصل رپورٹ ۷-۸ کالموں میں دو نمبروں میں شائع ہوئی۔ جس میں تصریحات

موجود ہیں :-

"...... فرنگی محلیوں نے یہاں آن کر کذب و افترا کا ایک جال بچھا دیا۔
...... فرنگی محلیوں کی شرکت کو شرکت عرس پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس دفعہ تو مولانا عبدالباری، علی برادران اور خلافت کمیٹی کے خلاف جہاد کرنے میں زیادہ تر سرگرم رہے، اور جس قدر آپ سے ہو سکا، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے خلاف خود آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے زہر اگلا، اور پروپگینڈا کیا۔ ...... مولانا عبدالباری صاحب مع و وقدوائی اور بہت سے فرنگی محلیوں کے جس وقت سے رو ولی تشریف لائے، اس وقت سے لیکر واپسی تک اسی جدوجہد اور سعی کوشش میں مصروف رہے کہ خلافت کمیٹی اور اس کے جملہ ارکان کو عموماً اور علی برادران کو خصوصیت کے ساتھ طرح طرح کے غلط اور جھوٹے الزامات لگا کر بدنام کریں، چنانچہ کذب و افترار کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جو برادران محترم کو نہ صرف وہابی بلکہ ملحد و کافر مشہور کرنے میں فرو گذاشت کیا گیا ......
علی برادران کی نسبت کذب افترار کا وہ طوفان برپا کیا گیا۔ کہ الامان والحفیظ (اب تو علی برادران فرنگی محل کے دائرہ اسلام سے بھی تریب قریب خارج ہیں۔ یعنی اب شریعی و سودی مسئلہ نہیں رہا، بلکہ راوی معتبر کے بیان کے مطابق بقول مولانا عبدلباری کے، الحاد و اسلام کا مقابلہ درپیش ہے۔ یعنی خلافت کمیٹی اور علی برادران الحاد پھیلا رہے ہیں اور فرنگی محل اپنے ناتوان بازوں سے اس کا مقابلہ کر رہا ہے ..... صرف زبانی ہی پروپگینڈا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ٹریکٹ پمفلٹ، اور ہنڈبل وغیرہ بھی کثیر تعداد میں تقسیم کئے گئے "

عارف صاحب جنوری کے پہلے ہفتہ میں دہلی پہونچے۔ مضمون کے

دونوں نمبر ۱۲ اور ۱۳ ار جنوری کے ہمدرد میں نکلے۔ "پارٹی والے" اور انھیں میں "ڈائری نویسی بھی ہے، پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ اور عارف صاحب کے "قلم توہب رقم" کی داد دل کھول کر دی (مضمون عارف صاحب کے نام سے نہ تھا۔ صرف "از قلم توہب رقم" تھا۔ ان کا نام خود محمد علیؒ نے دوسرے ہی دن ظاہر کر دیا) لیکن محمد علیؒ کے دل پر کیا بیت کر رہی۔ کسی مُرید کی ارادت وعقیدت پر اس سے سخت بار کبھی کیوں پڑا ہوگا؟ کسی دوست کی دوستی کی اتنی سخت آزمائش کبھی کاہے کو ہوئی ہوگی۔؟ مولانا عبدالباری پیرو مرشد بھی تھے۔ اور نہایت عزیز دوست ومحبوب بھی! برسوں کی دوستی، سالہا سال کی محبت، مدتوں کی عقیدت ایک عمر کا خلوص سب کا خاتمہ ایک ساتھ ہو رہا تھا! سارے رشتے دم کے دم میں ٹوٹ رہے تھے! کونسا دل اتنے کڑے امتحان کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔؟ اور پھر محمد علیؒ جو محبت کا پتلا، اور سرتاپا دل ہی دل تھا؟ مولانا کو چھوڑنا تنہا ایک شخص کو چھوڑنا نہ تھا۔ ایک ہی وقت میں دینی مربیؔ کو چھوڑنا تھا۔ دنیوی محسن کو چھوڑنا تھا۔ بہترین رفیق کار کو چھوڑنا تھا۔ مخلص ترین مشیر کو چھوڑنا تھا۔ محبوب ترین عزیز کو چھوڑنا تھا۔ عزیز ترین بھائی کو چھوڑنا تھا۔ سب کو ایک ہی وقت میں چھوڑنا تھا۔ جسم کا جان کو چھوڑنا تھا۔ اس شب میں محمد علی کو نیند کیسے آئی ہوگی؟ اس دن محمد علی سے کھایا پیا کیا گیا ہوگا! محمد علی نے کبھی ایک غزل میں، جس کا ہر شعر مزیدار ہے کہا تھا۔ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

شاعری ہو چکی۔ اب امتحان واقعات کی دنیا میں تھا، مرید نے مرشد کا دامن، خود مرشد ہی کی فرمائش پر خدا کے لئے پکڑا تھا۔ آج خدا ہی کے لئے وہ دامن ہاتھ سے چھوٹ بھی رہا تھا۔ اضمیر اور ایمان کا قدم درمیان میں نہ ہوتا۔ تو بھلا محمد علیؒ کو فرنگی محل سے کوئی چھڑا سکتا تھا؟۔

اور پھر عارف صاحب محمد علیؒ کی نظر میں کوئی لاغی اور واہی راوی نہ تھے،

ہمدرد کے سرگرم کارکن تھے مالک ہمدرد کی ہوا خواہی میں بہتوں سے آگے، اور کم از کم اس وقت تک محمد علی کے ایک خاص معتمد علیہ۔ جب وہ اپنی چشم دید شہادت جزم و وثوق کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، تو محمد علی کیسے نہ ان پر اعتبار کرتے، اور کہاں تک انھیں جھٹلاتے۔ خصوصاً جبکہ سارے قرائن و قیاسات، اور پہلے کی سنی ہوئی حکایات و روایات ان کی عین تائید میں ہوں ــــــــ مہینوں کا اہتمام ضبط ختم ہوا۔ مدتوں کی وضع احتیاط رخصت ہوئی۔ اور عارف صاحب کے مضمون کا پہلا نمبر نکلتے ہی دوسرے دن خود محمد علی کے قلم سے ہمدرد میں تقریباً پانچ کالم کا مضمون "تقاضائے وفا" کے عنوان سے نکلا۔!

میں نے اب تک کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب رہا، کہ باوجود فرنگی محلی سرگرمیوں کے ہم لوگ اور تمام کام چھوڑ کر فرنگی محل سے بحث و مباحثہ میں منہمک نہ ہو جائیں۔

مضمون شروع یوں ہوا۔ لیکن ناگواری اور یاس کی حالت میں بھی اعتدال و اقتصاد کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا۔ آگے چل کر کہتے ہیں :۔

"عارف صاحب غلطی پر ہیں اگر وہ اس پروپگینڈا کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی رائے میں تمام کام چھوڑ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ عارف صاحب میں مجھے ہمیشہ احساس تناسب کی کمی محسوس ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم رودولی شریف کے عرس کے پروپگینڈا سے انھیں اس قدر متاثر پاتے ہیں :۔

اجمیر کا "آل انڈیا" عرس، عرس رودولی کے دو ڈھائی ہفتے بعد ہونے والا تھا۔ عارف صاحب نے خبر دی تھی، کہ فرنگی محل اصل تیاریاں وہاں مقابلہ کے لئے کر رہا ہے، اور وہاں رودولی سے بھی کہیں بڑھ کر اور کہیں زیادہ زبردست پروپگنڈا ہوگا۔ اس لئے اہل خلافت کو وہاں پہونچنا بہت ضروری ہے۔ اس پر محمد علی لکھتے ہیں :۔

اجمیر شریف کے عرس میں شرکت میں اپنے لئے باعثِ خیر و برکت سمجھتا ہوں اور اگر اس آستانۂ گرامی سے فیض حاصل نہ بھی ہوتا۔ تب بھی جہاں اتنے مسلمان جمع ہوں وہاں پہونچنا ہم جیسے خادمانِ ملت کے لئے یوں بھی ابا ضروری ہے۔ لیکن ہم نہ بھی حاضر ہوسکے (اور خوف ہے کہ میں تو اس بار شاید محروم ہی رہوں) تب بھی خداوند کریم نے جس طرح اچانک ردولی شریف میں کذب و افترا کے تار عنکبوت کو پارہ پارہ کرنے کا سامان فراہم فرمادیا۔ اسی طرح اجمیر میں بھی وہی مسبب الاسباب اس کا سامان فراہم فرمادیگا بیت عنکبوت سب گھروں سے زیادہ کمزور ہے۔ اس کی شکست و ریخت اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔"

بڑا اعتراض نقض عہد بیعت ہی کا آکر پڑ رہا تھا۔ اس کے جواب میں یہ لکھنے کے بعد کہ اسلام و خلافت ہی کے لئے ہم انگریزوں سے لڑے، جن میں پل کر ہم جوان ہوئے تھے، شریف سے لڑے۔ ترکوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ ہندوؤں سے لڑنے کو تیار ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں :-

اسلام و خلافت ہی کے لئے ہم نے علماء ہند اور صوفیائے ہند سے رشتہ جوڑا تھا اور کبھی نقضِ عہد کے ہم مرتکب نہیں ہوئے۔ لیکن اسلام و خلافت ہی کے لئے ہم ایکبار نہیں، ہزار بار ان سے اپنے رشتہ کو توڑ دیں گے۔ اور صرف اسی خدا سے رشتہ جوڑے رہیں گے۔ جس سے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی ہم نے سوال الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کہکر رشتہ جوڑ لیا تھا......... ہم اپنے پیر و مرشد کے پاس فنافی الشیخ ہونے کی غرض سے نہیں گئے تھے۔ بلکہ فنافی اللہ ہونے کی غرض سے۔ اور ہمارے لئے وہی پرانا طریقہ آج بھی موجود ہے کہ فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ و رسولہ ان کنتم تومنون باللہ،

والیوم آلاخرہ!

معیار کی اس بلندی تک عام مخالفین و موافقین کیا پہونچنے پہ پارٹی والے ادھر کے یا ادھر کے، روح کی ان گہرائیوں کو کیا پہچانتے، اہل نظر خود دیکھیں کہ روح عارف صاحب کے مضمون کی کیا تھی، اور سوختہ دل محمد علی کی مضمون کی کیا۔ دنیا جو چاہے سمجھے، جو چاہے کہے، بہر حال خود محمد علی اپنی زبان سے یہ صدائے حق لگاتے رہے۔

جو کوئی ہم پر نکث عہد کا الزام لگائے۔ وہ میرے اس شعر کو یاد رکھے جسکو بحالت نظر بندی میں نے اپنی سب سے پہلی غزل میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

عہد اول کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

اور اگر اسی زمانہ کے میرے اس شعر پر بھی نظر رہے تو برا نہیں ؎

سرکش نہیں، باغی نہیں، غدار نہیں ہم
پر ہم پہ تقاضائے وفا اور ہی کچھ ہے

یہ تقاضائے وفا، صرف انگریزی حکومت ہی کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ ہر غیر اللہ کے مقابلہ میں ہے، میں نے آج تک ایک لفظ بھی مولانا عبد الباری صاحب کے خلاف نہیں لکھا، اور جو کچھ مولانا صاحب کے متعلق سنا تھا۔ کہ وہ ہمارے خلاف کہتے اور کرتے ہیں۔ اسے کبھی باور نہ کیا تھا۔ مگر......

اس "مگر" کے بعد فرنگی محل، اور خدام الحرمینی پارٹی کی چند حرکتوں کی تصریح ہے اور اس کے بعد:-

یہ وہ چیزیں تھیں جن کے بعد میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ انتظار کروں اور دیکھوں کہ مولانا صاحب جو خدام الحرمین کے صدر، اور فرنگی محلی حضرات

کے بزرگ ..... ہیں وہ ان کے افعال قبیحہ پر اظہار بیزاری فرماتے ہیں یہی نہیں کہ اظہار بیزاری اب تک نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ : ..... "

اس " بلکہ " کے بعد مزید جرائم کی تصریح ہے یہاں تک کہ

" اب عارف صاحب تحریر کرتے ہیں، کہ دہلی شریف میں جو پروپیگنڈا کیا گیا۔ اس میں مولانا صاحب خود بہ نفس نفیس شریک تھے "

محمد علی کے پہلو میں آخر گوشت اور پوست ہی کا دل تھا۔ پتھر کا ٹکڑا نہ تھا۔ پیمانہ صبر کیا اب بھی نہ چھلکتا؟ آگے جو کچھ لکھا ہے، روشنائی سے نہیں، خون دل سے لکھا ہے، طیش و غضب سے بگڑ کر نہیں، حزن و شکستگی سے گھٹ گھٹ کر۔

بحمد اللہ میں مولانا صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پیشتر بھی مسلمان تھا۔ آج بھی مسلمان ہوں۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ مسلمان رہوں گا، جب آٹھ برس علیگڑھ، اور چار برس آکسفرڈ میں رہ کر مجھ میں کفر و الحاد نے سرایت نہ کی تو اب جبکہ اسلام کے خاطر میں نے علیگڑھ سے بھی منہ موڑ لیا۔ اور آکسفرڈ پر بھی لات ماردی، کیا خداوند کریم مجھے کفر و الحاد کی طرف لیجائیگا؟ اب موت روز قریب تر معلوم ہوتی ہے۔ اب تو یہی دعا ہے۔ کہ گو زندگی عبادات و ریاضات میں صرف نہ ہوئی۔ مگر موت اس آخری عبادت و ریاضت میں نصیب ہو۔ جس کا نام شہادت ہے، اور میرا شعر سچا ثابت ہو ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والاخرہ توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین

اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنیوالے دین و دنیا دونوں میں تو ہی ولی ہے مجھے اسلام پر موت دے اور صلحا میں مجھے شامل فرما۔

مجھے فقط تیری خوشنودی منظور ہے۔

کیا ڈر ہے جو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

مجھ سے سب بیزار ہو جائیں، مگر تو اور تیرا رسول بیزار نہ ہوں، کسی سے بھی نقض عہد ہو، مگر مجھ سے اور تیرے رسول سے نہ ہو۔ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو جائیں۔ مگر وہ بیعت فسخ نہ ہو جو سب سے پہلی بیعت ہے ......
خداوندا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں اور تیرے رسول پاک سے، تیرے قرآن سے اور تیرے رسول کی سنت سے، اے کاش تو اور تیرا رسول بھی مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اگر تیری اور تیرے رسول کی خوشنودی حاصل ہو جائے، تو پھر کیا ہے۔ تب تو تیرا حشر ہوگا اور میں ہونگا۔ اور میرا یہ شعر میرا طغرائے امتیاز ہوگا کہ:۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

محمد علی کو دشمن تو دشمن، دوستوں نے بھی زود رنج اور مغلوب الغضب کہا ہے۔ زود رنجوں اور غصہ وروں کی یہی شان ہوتی ہے۔ کسی کسی بدزبان نے "مردود الطریقت" بھی کہدیا تھا۔ "مردودوں" کی جبین عبدیت ایسی ہی نورانی ہوتی ہے؟ حالات وحوادث تکوینی تو وہ چیزیں ہیں، جنھوں نے ام المومنین صدیقہ رض اور امیر المومنین علی رض مرتضیٰ تک کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا کر کے چھوڑا۔ پھر محمد علی اور ان کے مرشد کی کیا بساط تھی لیکن کیا امیر المومنین رض جب ام المومنین کے مقابلہ کے لئے باہر نکلے ہیں تو کیا دل اسے کوئی خوش آئند مشغلہ تفریح سمجھ رہا تھا؟ کیا ہر قدم مبارک پورے سکون قلب کے ساتھ اٹھ رہا تھا؟ کیا طبع گرامی پر کوئی بار نہ تھا؟ عام صالحین امت، یقیناً صحابہ اور خصوصاً خلفائے راشدین کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن بہر حال نسبت تو ایک ذرہ ریگ کو بھی آفتاب کے ساتھ رہتی ہی ہے محمد علی کے قلب کی حالت اس وقت کی، کون

بتلائے ؟ کس کو بتانے کی قوت ؟ کس کو بتانے کی فرصت ؟

مُرید کو چھوڑیئے مرشد کا سینہ بھی بہرحال۔ خالی نہ تھا۔ یہ تو شاید وہ موقعہ تھا کہ بے جان پتھر۔ اور بے حس پہاڑ تک حرکت میں آجاتے پھر، وہ تو ایک مومن کا قلب، ایک صاحب دل کا دل، ایک صاحب طریق کا سینہ تھا۔ اثر کیسے نہ ہوتا؟ اثر ہوا۔ مگر وہ بات ابھی اور فوراً کہنے کی نہیں، ۔اسوقت تو ظاہری آنکھوں کو یہ نظر آیا کہ اثر محمد علی کی تحریک کا نہیں۔ عارف صاحب کے مضمون کا پڑا۔ فریقین میں ضد ین پڑھیں جوش انتقام بھڑکا۔ اور مقابلہ کی تیاریاں اس عظیم الشان پیمانہ پر شروع ہوئیں کہ اب گویا آخری اور فیصلہ کن معرکہ ہو کر ہی رہیگا اب تک آویزش سپاہیوں کے درمیاں ہورہی ہیں۔ اب سورماؤں کے سورما، دونوں سپہ سالار، خود تلوار سونت سونت کر ایک دوسرے کے مقابلہ کے لئے بڑھے۔ ایک عظیم الشان ہولناک اور زلزلہ افگن تصادم اب ہوا اور جب ہوا۔ ہزارہا لکھوکھا سپاہیوں کے ہجوم میں کوئی خوف سے لرز رہا ہے۔ کوئی شوق ومسرت سے مست، لیکن منتظر سب کے سب، نگاہیں سب کی جمی ہوئی، کان سب کے کھڑے ہوئے ——— ادھر بندے ان تدبیروں میں سرگرم ومستغرق، ادھر تقدیر الٰہی ایک دوسرے ہی کھیل میں مصروف!

---

۷ جولائی ۲۶ء یکشنبہ ۔ رجب ۴۴ھ کی غالباً دوسری تاریخ تھی یہ ڈائری نویس لکھنؤ میں تھا۔ عشا کی نماز اول وقت پڑھ ہی رہا تھا۔ کہ معلوم ہوا۔ مولانا عبد الباری صاحب پر سہ پہر کو فالج کا حملہ ہوا۔ اور مولانا اسوقت سے بیہوش ہیں۔ راوی خود ایک طبیب حاذق تھے۔ اور مولانا کی حالت دیکھے چلے آرہے تھے، فرمایا کہ فالج بہت شدید قسم کا ہے۔ اور زندگی کے لئے اچھا خاصہ خطرہ ——— آہ۔ انسان ضعیف البنیان، اور اس کی تدبیریں اور ارادے! کیا کیا تجویزیں ہورہی تھیں، کیسے کیسے منصوبے بندھ رہے تھے، اور ہو کر کیا رہا! ——— عارف صاحب کا مضمون اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ کام جو آج تک کسی کے بنائے

بھی نہ بن آیا تھا۔ نہ خلیق الزمان کے نہ ظفر الملک کے نہ عبدالماجد دریابادی کے نہ عبدالرزاق یح آبادی کے فرنگی محل سے محمد علیؒ کو اکھیڑنے اور برگشتہ کرنے کی کوشش ابتک محمد علی کے خداجانے کتنے رفیق اور نیازمند کر چکے تھے۔ بعض حب علی کی بنا پر اور بعض بغض معاویہؓ سے کوئی محمد علی سے فرط خلوص و نیازکی بنا پر اور کوئی محض فرنگی محل کی ضد اور عداوت پر۔ لکھنو ان کوششوں کا مرکز تھا۔ اور یہ ڈائری نویس بڑی حد تک تو نہیں۔ لیکن ایک خاصی حد تک ان کوششوں میں شریک و معین۔ لیکن محمد علی کے تعلقات محبت، مولانا عبدالباری صاحب سے اس درجہ محکم و استوار تھے۔ کہ کسی کی کچھ نہ چلتی۔ عمر میں بالکل پہلی بار اب یہ اتفاق ہوا تھا، کہ گوشت، ناخن سے جدا ہوا دوست کا دل دوست سے عزیز کا دل عزیز سے مرید کا دل مرشد سے، ہٹا، اور دل ہی نہیں لفظ و عبارت کا جامہ پہن ہمدرد کے صفحات پر نمودار ہوئیں۔ یہ کامیابی اور کارگزاری کچھ تھوڑی تھی! یاروں کی دیرینہ تمنائیں بر آئیں! عارف صاحب کو داد بھی ملی۔ اور مبارکباد بھی زبانی بھی اور اخباری مضمون میں بھی۔

خواجہ خواجگان معین الدین چشتی سنجری رحمتہ اللہ علیہ کا عرس اجمیر میں ۶ رجب کو ہوتا ہے۔ ہندوستان کا شاید سب سے بڑا عرس یہی ہے۔ معتقدین کا ہجوم عظیم، زائرین کی ریل پیل، مشائخ اور پیرزادے ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھے۔ علی برادران اور خلافت کمیٹی پر یورش کا موقع اس سے بہتر کہاں مل سکتا تھا۔ ردولی کے عرس کو اور عارف صاحب کے مضمون کو ابھی دن ہی کے ہوئے تھے۔ غصہ تازہ جوش بے اندازہ۔ زخم ہرا، بس یہ ٹھہری کہ خدام الحرمین کا جلسہ عظیم الشان پیمانہ پر وہیں ہو۔ لکھنو اور دہلی اور لاہور، اور بمبئی، سب کہیں کا انتقام دل کھولکر کرلیا جائے، اور اس زور کی یلغار کی جائے، کہ ان مردودوہابیوں کا نام و نشان نہ رہنے پائے۔ اصل منصوبے تو جو کچھ بند سے ہوں گے۔ اُن کا پورا اور صحیح علم خود انھیں حضرات کو ہو سکتا ہے۔ البتہ کچھ اڑی اڑی خبریں اُدھر کی اس کیمپ میں بھی آجاتی تھیں، اور یہ اندازہ ہو جاتا تھا۔ کہ

صوفیانِ باصفاؔ "مرشدانِ بے ریا" نے ایکا کر کے ایکی یہ طے کر لیا ہے، کہ اپنی جان لڑا دینگے لیکن نا ہنجار وہابیوں کا قلع و قمع کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ اور ان بدبختوں کا پیشوا و سردار محمد علی تھا۔ اسے زیر کر لیا۔ تو بس فتح ہی فتح ہے۔ اسے گرا لیا تو پھر مقابلہ پر کون کھڑا رہ سکتا ہے ـــــ عرس کی اصل تاریخ ۶ ر رجب ہے۔ مولانا کا مقدمۃ الجیش کئی دن قبل روانہ ہو چکا تھا، اور مولانا بہ نفس نفیس ۲ ر کی شام کو روانہ ہونے والے تھے کہ سہ پہر ہی کو یہ واقعۂ فالج پیش آ گیا۔ آج کا دن خاص مشغولیت و اہتمام کا دن تھا۔ خدام الحرمین کی انتظامی کمیٹی کا جلسہ کئی گھنٹے تک زور و شور سے رہا تھا۔ مولانا اس کے خادم الخدام (صدر) تھے۔ حسرت موہانی صاحب سے بھی خاص شورے ہو رہے تھے، محمد علی سے مقابلہ آسان نہ تھا۔ شریعتی فوج نے اپنے سب سے بڑے جنرل کی زندگی کو داؤں پر لگا دیا! ـــــ مولانا کے کان خوب ہی بھرے گئے تھے کہ ذرا دیکھئے تو محمد علی کی گستاخیاں مرید ہو کر مرشد سے یہ زبان درازیاں! ایسا بے ادب اب ہرگز کسی رو رعایت کا مستحق نہیں، خدا کے لئے اٹھیئے۔ اور اس "بے دین" و "لا مذہب" کو ایسا سبق دیجئے کہ دنیا کو عبرت ہو کر رہے۔

لکھنو میں اطباء و حاذقین کی کیا کمی، بہتر سے بہتر حکیم اور نامور سے نامور ڈاکٹر علاج کے لئے جمع ہو گئے۔ مولانا کی خدمت اپنے لئے باعث سعادت و نجات سمجھنے والے اور کچھ ایسے بھی جو سر تا سر مولانا کے ممنون کرم و بندۂ احسان تھے۔ مولانا کا مزاج اس قسم کا تھا۔ کہ دوست دشمن، مرید غیر مرید یا معتقد یا غیر معتقد۔ سب کے ساتھ یکساں شفقت و کرم کا برتاؤ رکھتے تھے، درِ فیض سب کے لئے کھلا ہوا۔ جود و سخا کے لئے نہ زمان کی قید نہ مکان کی، صبح و شام اچھے سے اچھے معالجین کا مجمع لگ گیا۔ وہ نازک مزاج ماہرین فن، جو دوسروں کے لئے مشکل ہی سے باہر قدم رنجہ فرماتے، یہاں بے بلائے موجود زبانِ حال سے دعویٰ اس کا کہ

ہر یکے از ما مسیحِ عالمے ست　　　ہر الم را در کفِ ما مرہمے ست

سب نے مل کر جان لڑادی۔ تیمارداری کے سامان بہتر سے بہتر موجود، عزیزوں معتقدوں اور مریدوں نے نہ دن کو دن سمجھا، نہ رات کو رات، بالنے اور بڑے گاؤں کے اخلاصمندوں کا نمبر فرنگی محل کے خاص عزیزوں سے بھی کچھ بڑھا ہوا۔ غرض ہادی تدبیریں، ایک سے ایک بڑھکر۔ جتنی بھی ممکن ہوئیں۔ سب عمل میں آ کر رہیں، اور علاج اس حد کا ہوا۔ کہ اچھے اچھے رئیسوں امیروں کا بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا لیکن

ہر چہ کردند از علاج واز دوا
گشت رنج افزوں حاجت ناروا

یہ فالج "طبی" فالج تھا کب؟ اور جو مرض تھا، وہ کسی طبیب کے بس کا تھا ہی کہاں؟

بیخبر بودند از رازِ دروں
استعیذُ اللہ مما یفترون

نبض اور قارورہ کی دیکھ بھال کرنے والے، روح کی بیقراریوں کا علاج کیا کرتے اور ٹمپریچر کی ڈگریاں ناپنے والے دل کی چوٹ کو کیا پہچانتے؟

رنجش از صفرا واز سودا نبود
بوئے ہر ہیزم بدید آید ز دود!

تن کی رنجوری کو سب نے دیکھا۔ دل پر جو گزر رہی تھی۔ اُس سے کوئی باخبر نہ ہوا۔ اوپر کے زخم پر مرہم رکھنے سب دوڑے اندر کے ناسور کا، پتہ بھی کسی کو نہ چلا، کسی کو کیا خبر تھی کہ:-

تن خوش ست واو گرفتار دل ست!

اس آزار کا درد کس کو؟ اس تڑپ کی خبر کسے؟ اس بیماری کی مثال کس بیماری سے دی جائے؟ اور اس کی دوا، دیس کی کس قرابادین۔ اور ولایت کی کس فارما کوپیا کے اوراق میں تلاش کی جائے؟

نیست بیماری چو بیماری دل عاشقی پیداست از زاریِ دل

عارف صاحب کے مضمون کا اثر سب نے دیکھا۔ محمدؐ علی کا مضمون خون دل کی روشنائی۔ اور سوز جگر کے قلم سے لکھا ہوا ابھی آخرائی ہمدرد میں چھپا۔ اور عارف والے مضمون سے کہیں زیادہ بڑھا گیا تھا۔ اس کا اثر کسی نے نہ دیکھا! پارٹی کا نام لیکر جو وار ہوا! اس تلوار کی چمک سب نے دیکھی اللہ کے نام کی گونج میں جو پھانس دل میں چبھی۔ گھسی رگ جان میں اتری روح کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوئی، اس پر نظر کسی کی نہ گئی۔ خدام الحرمین کے صدر کے جسم کو زبان کو، قلم کو، سرگرم عمل سب نے پایا۔ محمدؐ علی کے مرشد کی روح کو حرکت میں آتے۔ غیرت کھاتے، بیخود ہوتے کسی نے نہ دیکھا۔ محمدؐ علیؒ کا مضمون کوئی معمولی تھا؟ تقاضائے دفا" کا تقاضا کوئی معمولی اور رسمی تقاضا تھا؟ ایمان اور اسلام کی پکار کوئی معمولی پکار تھی؟ مضمون کی عبارتیں اسی ڈائری میں چند ورق اوپر نقل ہو چکی ہیں۔ دل والے پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان کا نتیجہ کیا ہونا تھا؟ پکار کیا تھی؟ پکارنے والا کون تھا؟ اور پکارا گیا کس کو تھا؟ واسطہ کس کے نام کا دلایا گیا تھا؟ مضمون ۱۳ جنوری کے اخبار میں شائع ہوا، مولانا پر فالج ۱۷ کو گرا۔ حیرت فالج گرنے پر نہ کیجئے۔ حیرت اس پر کیجئے کہ یہ تین چار دن کا وقفہ درمیان میں کیسے پڑ گیا۔ مولانا کا قلب کیا بالکل بےحس تھا؟ آخر ایک صاحب ایمان کا قلب تھا۔ صاحب ارشاد کا قلب تھا۔ محمدؐ علیؒ کے بھی پیرو مرشد کا قلب تھا۔ روحانی رہنما کا قلب تھا مولانا صاحب سماع تھے، اور صاحب سوز و گداز۔ پیشہ ور قوالوں کی زبان سے کسی کا نام سُن سُن کر بارہا اپنا ملبوس اور اپنا خرقہ، اپنا پیرہن اور اپنا عمامہ، اتار چکے تھے، آج اُسی ہیبت والے اور عظمت والے کا نام ایک اخلاص کے پتلے، سر فروش اور جانباز سے سنا تھا۔ کیا جامۂ ہستی اتار پھینکنے میں رکتے اور جھجکتے؟ محمدؐ علی کی حلق سے آواز تو وہ نکلی تھی، جو پتھر کو پگھلا دیتی، فولاد کو گلا دیتی، چٹان کو ہلا دیتی، کیا اپنے ہی مرشد کے قلب پر اتنا اثر بھی نہ کرتی؟ فرنگی محل کے آخری دور کا یہ شیخ طریقت بزرگوں اور پیروں کے نام پر خدا جانے کیا کچھ لٹا چکا تھا۔ کیا اللہ کا نام سُن کر اپنی نقد جان کی نذر دینے میں بخل کرتا؟ کیا اوس کی روح خدانخواستہ

خبثت سے خالی، اور اُس کا سینہ، انابت سے بے نور تھا؟ روح تھرتھرائی، جان کپکپائی، اور ناسوتیوں نے اپنی زبان میں ایک اصطلاح "فالج کی گھڑی"! یہ فالج ۷۰-۸۰ گھنٹے کے بعد کیوں گرا۔ حق تو یہ تھا کہ عین اُسی وقت قلب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اُسی لمحہ کلیجہ پانی پانی ہو کر بہہ جاتا۔ آنکھیں اس تحریر کے بعد کوئی دوسری تحریر نہ دیکھتیں کان اس آواز کے بعد پھر کوئی آواز نہ سنتے! ——— شمس تبریزؒ کی قسمت میں اپنے عاشق زار مریدؒ جلال الدین رومیؒ کے ایک فرزند کی تلوار سے جام شہادت پینا لکھا تھا، محمد علیؒ کے مرشد اپنے نصیب میں محمد علی کے قلم سے اپنا شہید ہونا لکھا کر لائے وہ حکایت کتابوں میں پڑھی، یہ ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں آیا! ———

عاشقوں کی موت اور شہادت کے بھی آہ کتنے آہنگ اور کتنے طریقے ہیں! کہیں غیروں کی تلوار کہیں اپنوں کا پیار! اور شہادت زار الفت میں بلانے کے کتنے حیلے اور کتنے بہانے، اور بلانیوالوں کے چہرہ کے کتنے نقاب ہیں!

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ
عشق عاشق جانِ او رر اسوختہ
کہربا عاشق بہ شکل بے نیاز
کاہ می کوشد دراں راہِ دراز
عقل حیران کایں عجب او را کشید
یا کشش زانسو بدیں جانب رسید

انتقال ۱۹ - ۲۰ جنوری (سہ شنبہ و چہار شنبہ) کی درمیانی شب میں ہو گیا، محمد علی غریب تین سو میل دُور دہلی میں بیٹھے ہوئے۔ کچھ خبر نہیں کہ لکھنؤ میں آناً فاناً کیا قیامت گزر گئی۔ لکھنؤ سے انھیں خبر کون کرتا۔ کرتا تو یہی ڈائری نویس کرتا، لیکن

اُسوقت مخالفتوں کے شباب میں اس فرض کا احساس کہاں، محمد علی کو شدید وخطرناک علالت کی خبر سید جالب مرحوم کے اخبار ہمدم کے ذریعہ سے چہارشنبہ کی صبح کو ہوئی اُسی وقت لکھنؤ شاید پہلے تار، اور پھر ٹیلیفون سے دریافت حال کیا۔ جواب میں بجائے علالت کے انتقال کی خبر پہونچی! ـــــ جو لوگ محمد علیؒ کی حساس طبیعت سے واقف ہیں۔ اس ناگہانی اطلاع پر غم وصدمہ کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ پیرومرشد اور بہترین دوست کی وفات کی خبر آیا، اچانک ملے، اور نہ اب کوئی موقع مصالحت کا باقی، نہ کوئی موقع آخری خدمتگزاریوں کا! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ محمد علی کیسا تلملا تلملا کر رہے ہونگے ـــــ پہلی ٹرین سے مع بیگم صاحبہ کے روانہ ہوئے، اور پنجشنبہ (۲۱ر جنوری) کو صبح تڑکے لکھنؤ پہونچ گئے۔ تدفین خاندانی قبرستان، ملا انوار کے باغ میں ۲۰ر کی دوپہر کو ہوچکی تھی، اور اس دھوم دھام اور اژدہام کے ساتھ، کہ لکھنؤ کی تاریخ غالباً اس نظیر سے خالی ہے، اسٹیشن سے سیدھے قبرستان پہونچے۔ اور مٹی کے ڈھیر سے لپٹ بے اختیار رونے لگے ع۔

به جنازه گر نیائی بمزار خواهی آمد

دل ایک دن قبل ہی سے رو رہا تھا، اسوقت آنکھوں سے بھی چشمے اُبل پڑے، اسوقت کی مصوری کون کرسکتا ہے؟ کن لفظوں میں کی جاسکتی ہے؟ آہ، جو قلب سرتاپا درد تھا، یکسر سوز وگداز تھا، اجنبیوں اور بیگانوں کے لئے بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا تھا۔ اسوقت اپنے مرشد کے مزار پر حاضر تھا، اپنے محبوب ترین دوست کی قبر پر کھڑا تھا۔ جذبات میں جتنا بھی تلاطم ہوتا۔ سب واجبی تھا۔ خدا جانے دل میں کتنے ارمان ہونگے، کیا کیا آرزوئیں ہونگی، کیسے کچھ گلے شکوے بھرے ہونگے، کیسے کیسے راز ونیاز سینہ سے لب پر آنے کو مچل رہے ہونگے کتنی ہدایتیں لینی تھیں۔ کتنے مشورے دینے تھے، آہ، کہ یہ سب ایک نہ معلوم مدت کے لئے سینہ کے صندوق میں بند کے بند رہ گئے! جیتے ہوتے تو کبھی مرشد روٹھ جاتے، مُرید منالیتا۔ کبھی مرید ناز کرتا مرشد فرط شفقت سے گلے لگالیتے! یا الہ العالمین، یہ سب بات کہتے، پلک جھپکتے، خواب

وخیال بنگیا! بلا وہم گمان بالکل دفعتہً اور اچانک! لکھنو والوں کو کم از کم دو تین دن بیماری کے دیکھ بھال میں تو لگے، محمد علی بیچارہ کو تو بس ایک بیک وہی خبر پہونچی، جس کے بعد پھر کوئی خبر نہیں رہ جاتی! محمد علی جذبات محبت کا پتلا، حیرت ہے کہ اتنا ضبط بھی کیونکر کر سکا۔ صرف رونے اور پیٹنے پر کفایت کیسے کی! پچھاڑیں کھا، بیہوش ہو، گر کیوں نہ پڑا! کلیجہ کیوں نہ پاش پاش ہوگیا؟ —— "کشتہ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ" یہ مصرعہ پڑھا بار ہا تھا! ایک نئے رنگ میں عملی شرح اس وقت دیکھنے میں آئی!

ونزعنا ما فی صدورھم من غلّ تجری من تحتھم الانھار (اعراف ۶ ع ۵)

جو کچھ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے سے غبار تھا۔ اسے ہم دور کر دیں گے اور ان کے محلوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

کلام پاک میں ایک جگہ اہل جنت کا تذکرہ ہے، اور وہیں کی یہ آیت ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنہیں جنت میں بڑے بڑے درجے نصیب ہوں گے اُن میں بھی کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے، جو دنیا میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے، دنیا میں ایک دوسرے کی طرف سے اپنے سینے میں رنج و کدورت رکھتے تھے، گویا، یہ باہمی کدورت و رنجش نہ لازمی طور پر اُن کے کمالات روحانی و فضائل اخلاقی کے منافی ہے اور نہ انعامات جنت کے! اور تفسیروں میں قتادہؒ کے واسطے سے حضرت علی مرتضیٰؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ یہ آیت میرے اور طلحہ و زبیر وغیرہم کی شان میں ہے" اللہ اللہ! ہم ضعفاء امت کی رعایت کس درجہ کریم کو ملحوظ رہی ہے، اور ہماری تسکین کے سامان، قدم قدم پر کس طرح بہم پہونچا دیئے گئے ہیں۔ جب جلیل القدر صحابۂ کرام تک، عشرہ مبشرہ تک اس آیت کے تحت میں آجاتے ہیں، تو چودھویں صدی کے ماتحین اپنے لئے کیوں کڑھیں، اور اُن کے آپس میں اختلافات شدید سہی، لیکن اگر اخلاصمندی کے ساتھ ہیں تو کیوں انھیں مدارج قرب و وصول سے محروم رکھیں؟

پیر و مرید کی جنگ ختم ہوئی۔ حبیب و محبوب میں وصال ہو کر رہا۔ ع

درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

صلح ہوئی۔ لیکن سنگ مزار کے اوپر!

عید ہوئی ذوق ولے شام کو!

شاعر نے پہلے مصرعہ میں "روئے دلارام" دیکھنا حالت "نزع" میں بیان کیا ہے، یہاں تو نزع" میں نہیں، نزع کے بعد کا معاملہ ہو کر رہا!

محمد علی مزار پر فاتحہ پڑھ کر فرنگی محل آئے۔ یہاں کے فاتحوں میں شریک ہوئے مولانا کے بھتیجے اور داماد قطب میاں صاحب کی باضابطہ جانشینی ہوئی۔ محمد علی بھی اس تقریب میں شریک رہے۔ اپنی اور اپنے بھائی کی طرف سے نذر پیش کی۔ پارٹی والوں سے جب ملاقات ہوئی، تو ایک ایک کو سمجھایا کہ بس اب پچھلی باتوں پر خاک ڈالو، جو ہوتا تھا ہو کر رہا، قطب میاں ہر طرح قابل ہمدردی ہیں ان کے ساتھ ملکر کام کرو۔ انھیں اپناؤ۔ کسی نے سنکر سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا کہا، اور کسی نے صرف سمعنا۔

"قاہرہ ۱۰ر جنوری جدہ کا ایک تار منظر ہے کہ ابن سعود کے حجاز اور مکہ معظمہ کے بادشاہ ہونیکا اعلان کیا گیا ہے"

رائٹر کا ذراسا تار ۱۳ر جنوری ۲۶ء کو ہندوستان کے سارے پرچوں میں ایک معمولی خبر کی طرح شائع ہوا۔ مگر محمد علی کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ کا پیغام تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟۔ محمد علی کی ایک عمر ملکیت کے خلاف جہاد کرتے میں گزر چکی تھی اور حجاز میں ملکیت کا استیصال، اور بجائے اس کے، خلافت راشدہ کے نمونہ پر ایک جمہوریہ شرعیہ کا قیام ان کی رائے میں، سالہا سال کے غور و فکر کے بعد عالم اسلام کی آئے دن کی مصیبتوں کا واحد علاج تھا۔ اور سو دواؤں کی ایک دوا، ان کی نظر میں بس یہی تھی، ملکیت سے ان کی یہ مراد نہ تھی، کہ حجاز میں کسی قسم کی بھی بادشاہت نہ رہنے پائے، بلکہ مراد صرف اسقدر تھی کہ آئندہ جو حکمران وہاں کا ہو، وہ اپنی ذاتی اہلیت کی بناء پر چنا جائے،

اور اس اہلیت کی جانچ، عالم اسلام کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہو، یہ نہ ہو کہ چونکہ کوئی شخص فلاں خاندان کا ہے یا پچھلے بادشاہ کا فرزند اکبر ہے، اس لئے وراثتہً حاکم ہو جائے —— خلافت راشدہ کا نام جو بار بار لیتے تھے۔ اس سے بھی مدعا یہی دکھانا تھا، کہ وہاں حکمرانی نہ کسی خاندان کے ساتھ مخصوص تھی، اور نہ وراثتہً باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی تھی۔ اس ملکیت کی جڑ کاٹنے کی وہ کیسی کیسی سعی اب تک خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے کر چکے تھے، خود سلطان ابن سعود کی زبان سے بار بار اس کے وعدے لے چکے تھے ترکوں کے الغائے خلافت کے بعد بس اسی توقع پر جی رہے تھے، اور سلطان کے انھیں وعدوں پر بھروسہ کر کے خدا جانے اپنے کتنے پرانے رفیقوں دوستوں، عزیزوں سے لڑ چکے تھے، اب یہ خبر جو یک بیک آئی۔ تو گویا زمین پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔ سب نے اس خبر کو عام خبروں کی طرح معمولی طور پر چھاپ دیا۔ اور جو سلطان کے ہم عقیدہ تھے۔ وہ تو مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ لیکن ہمدرد میں یہ خبر چھپی تو سیاہ ماتمی جدول کے اندر ڈبل کالم جلی عنوان کے ساتھ۔ اور عنوان کے الفاظ یہ رکھے گئے۔ "ایک نہایت اندوہناک خبر"۔ اور خبر کے معاً بعد یہ لکھا گیا، کہ

"ہم اس خبر بد کو جس نے ہمارے قلب کو سخت ترین صدمہ پہونچایا ہے۔ اُسی طرح شائع کرتے ہیں جس طرح کہ رائٹر کے ذریعہ سے ہم تک پہونچی ہے"

اور اس کے بعد بہت جلی خط میں گویا کوئی سخت مصیبت نازل ہو گئی ہے:—

ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہئے کہ خداوند کریم کی کارسازی پر بھروسہ رکھیں۔ اُس سے مایوس نہ ہوں، جو کچھ کیا جائے سوچ سمجھ کر کیا جائے، نہ کہ حالت اضطراب و سرگردانی میں"

ہندوستان کے **مسلمان** دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک سلطان کے دوست دوسرے سلطان کے دشمن، ایک وہ جو سلطان کے ہم عقیدہ تھے، ان کے نزدیک

سلطان، سلطان اسلام تھا، مجاہد تھا۔ مردان حق میں سے تھا، غازی تھا، دین متین کا محافظ و مجدد تھا، اور بدعت شکن، کہ صدیوں کے مشرکانہ رسوم کو توڑ پھوڑ کر رکھدیا تھا، دوسرے وہ جو عقائد میں سلطان کے مخالف تھے اُن کے نزدیک ابن سعود وہابی تھا۔ ضال تھا، مضل تھا، کانا دجال تھا، اور اس کا یہ جرم ناقابل معافی اور ناقابل تلافی تھا، کہ اُس نے مزارات مقدسہ کے قبے گرا دیئے تھے، قبور صالحین کی بے حرمتی کرڈالی تھی، قبہ شکن تھا، قبور کن تھا، دشمن رسول وآل رسول تھا۔ ہندوستان کے ۷۔۸ کروڑ مسلمانوں کی بڑی آبادی۔ انھیں دو غالی گروہوں کے درمیان تقسیم ہوکر رہ گئی تھی، محمد علیؒ مع ایک مختصر جماعت علمار کے (اور جمیعت علماء کا اسوقت تک یہی مسلک تھا) ان دونوں گروہوں کے غلو سے بالاتر تھے۔ وہاں تو دھن ہی دوسری تھی اپنا ذات سے حنفی تھے۔ صوفی تھے، لیکن آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور دل رو رہا تھا۔ کہ وقت اسلام پر کونسا آکر پڑا ہے۔ جب حملہ عین قلب پر ہو رہا ہو تو سر کے بالوں کی پرواہ کسے رہے گی، اور پیر کے ناخنوں کے بچانے کی فکر کون کرے گا؟ کفر والحاد کی گولیاں تو بلا تفریق وامتیاز ہر مسلمان کہلانے والے کے سینہ پر آکر پڑ رہی تھیں، اور یہ کبھی پوچھتی ہی نہ تھیں کہ ان میں ابوحنیفہؒ کا ماننے والا کون ہے، اور ابن تیمیہؒ کا نام لینے والا کون؟ مغربی اپنے کو کون کہلاتا ہے۔ اور اشعریت پر اپنی فخر کون کرتا ہے؟ معراج جسمانی کا قائل کون ہے اور منکر کون، محرم میں سینہ کون پیٹتا ہے اور بڑے "پیر" صاحب کی گیارہویں کون مناتا ہے، اندرونی عقیدے جو کچھ بھی ہوں، وہاں تو محض مسلمان کا نام کافی تھا؟ جو زبان سے اپنے مسلمان ہونیکا اقرار کرے۔ جو مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے کو مسلمان لکھائے، بس فلک پیر اس کا دشمن تھا۔ اور محمد علی اس کا دل سوز خادم اور غمخوار ہوا خواہ دل میں درد تھا تو اسلام کے کلمہ کا اور تڑپ تھی تو اس کی کہ اغیار کے دست برد سے کسی طرح محفوظ ہوکر سارا عالم اسلام متحد ہو۔ اور منکروں کے مقابلہ میں محمدیوں کا ایک متحدہ محاذ قائم ہو۔ جس نے اس اتحاد پر ضرب لگائی۔ بس محمد علی اس کے دشمن شریف حسین کا اصل قصور یہی تھا۔ کہ اس نے عین وقت پر خلیفۃ المسلمین سے

غداری کر کے قبائے خلافت چاک کر دی۔ مصطفےٰ کمال کی جوانمردی اور دوسرے کمالات سب مسلّم۔ لیکن اس جرم کو محمد علیؒ نے آخر تک نہ معاف کیا۔ کہ اس بیدرد نے منصب خلافت توڑ کر ہمیشہ کے لئے مرکزیت اسلام پر ضرب کاری لگادی!۔۔۔۔ ۔۔۔۔ جس کے خیالات یہ ہوں جو اس عالم میں رہتا اور جیتا اور سانس لیتا ہو، وہ نجدیوں کی رورعایت کیوں کرتا۔ اور ابن سعود کی مروت میں آ کر کیسے رہتا؟

خلافت کمیٹی محمد علی ہی کی تحریک پر ڈیڑھ سال اپنا نقطۂ نظر سلطان ابن سعود کے سامنے یوں واضح کر چکی تھی:۔

"...... ہندوستانی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حجاز پر جو تمام دنیائے اسلام کا مرجع ہے، کوئی بادشاہ یا سلطان حکومت نہیں کر سکتا، بلکہ وہاں ایک ایسی جمہوریت قائم کرنا چاہئے۔ جو غیر مسلم اغیار کے اثر سے بالکل پاک ہو۔ ہر مسلمان کو یہ اصول مدنظر رکھنا چاہئے تاکہ جنگ و خونریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ رائے ہے کہ اسوقت اراکین حجاز کی ایک عارضی جمہوری حکومت قائم ہو جائے۔ اور مستقل حکومت کا فیصلہ اسلامی کانفرنس پر چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے کہ دنیائے اسلام کو امیر کا تقرر نا قابل قبول ہے۔

خلافت کی جس مجلس عاملہ نے یہ تجویز پاس کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجی تھی، اُس میں علاوہ محمد علی کے مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں، مرحوم و مغفور، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر محمود، اور شعیب قریشی صاحب شامل تھے، ان سب کی اتفاق رائے سے ۵ر اکتوبر ۲۴ء کو دہلی میں یہ تجویز منظور ہوئی اور ۷ر اکتوبر کو تار پر روانہ ہوئی۔ ۲۴ر اکتوبر کو سلطان کا جواب۔ الفاظ ذیل میں تار پر مولانا شوکت علی کو موصول ہوا۔:۔

"آپ کا تار پہونچا۔ آپ کے اور مسلمانان ہند کے صحیح خیالات
کا شکریہ۔ جب تک حسین یا اُس کے خاندان کا کوئی فرد مکہ معظمہ میں
حکومت کرتا رہے گا۔ اُسوقت تک پبلک کو امن و صلح میسر نہیں ہوسکتی
جو کچھ واقع ہوا۔ اس کا ذمہ دار صرف حسین ہے جس کے افعال سے
مکہ معظمہ کو اب آزادی مل گئی۔ آخری فیصلہ دنیائے اسلام کے
ہاتھ میں ہے۔

محمد علی کیا اب بھی مطمئن نہ ہوتے؟ دل خوش۔ کہ دیرینہ آرزو کے برآنے کی گھڑی
قریب آگئی۔ طبیعت مسرور کہ خوش آیند خواب کی تعبیر پوری ہونے کو آئی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۲۴ء
کو قاضی القضاۃ نجد عبداللہ بن بلیہید کا بھیجا ہوا ایک طویل تار موصول ہوا جس
میں تھا کہ سلطان نے نجد سے مکہ کو روانہ ہوتے وقت حسب ذیل تقریر کی:۔

میں مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ بلکہ وہاں کے
باشندوں کو مظالم اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کی مصیبت سے نجات
دلانے جا رہا ہوں...... اب مکہ معظمہ میں بجز شریعت کوئی
سلطان نہ ہوگا...... چونکہ معظمہ سے جملہ مسلمانان عالم کو تعلق
ہے اس لئے وہاں کی پالیسی دنیائے اسلام کی مرضی کے
مطابق ہوگی۔ ہم جملہ نمایندگانِ عالم اسلام کی کانفرنس مکہ معظمہ میں منعقد
کریں گے۔ اور ہر اُس مسئلہ پر ان کی رائے لی جائے گی۔ جس کی بدولت
بیت اللہ گناہوں اور ذاتی اغراض کی تحریکوں سے پاک رہے...
حجاز ہر شخص اور ہر نیک بندہ کے لئے کھلا رہے گا۔

اس نے گویا اور مہر تصدیق لگا دی۔ درمیان میں سلطان کے جو پیامات اس سلسلہ
میں آئے یا شائع ہوئے۔ وہ سب اسی کے موئد۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۲۴ء میں جو دعوت
نامہ سلطان کی طرف سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لئے جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ العلماً
کے اکابر کے نام آیا۔ اُس نے تو شک واشتباہ کی گنجایش ہی نہ چھوڑی۔ طویل دعوت نامہ

کے درمیان یہ عبارتیں بھی تھیں :۔

میں اُس خدائے برتر کی قسم کھا کر جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہتا ہوں کہ میرا مقصد حجاز پر تسلط یا حکومت کرنا نہیں ہے۔ حجاز میرے ہاتھ میں اُس وقت تک ایک امانت ہے جب تک اہل حجاز خود اپنے میں سے ایسے حاکم کا انتخاب نہ کریں، جو عالم اسلامی کی بات ماننے والا اور ان اقوام اسلامیہ اور طبقات ملیہ کے زیر نگرانی رہے۔ جنھوں نے اپنی غیرت وحمیت دینیہ کا ثبوت بہم پہونچا دیا ہے۔ مثلاً مسلمانان ہند۔

ہمارا وہ مطمح نظر جس کا عالم اسلامی سے ہم نے وعدہ کیا ہے اور جس کے لئے ہم شمشیر بکف رہیں گے۔ مجملاً حسب ذیل ہے :۔

(۱) حجاز کی حکومت حجازیوں کا حق ہے لیکن عالم اسلامی کے جو حقوق حجاز سے متعلق ہیں۔ اُن کے لحاظ سے حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے۔

(۲) ہم ایک استفتاء عام عنقریب جاری کریں گے۔ جس میں حاکم حجاز کے انتخاب اور عالم اسلامی کی نگرانی کے متعلق استفسار ہوگا۔ اس کے لئے وقت کے تعین بعد میں کی جائے گی۔ اور پھر ہم اس امانت حجاز کو اُن اصول کے ماتحت اس حاکم کے سپرد کردیں گے۔

کیا محمدؐ علی اب بھی اعتماد نہ کرتے ؟ کیا اتنی تصریحات پر بھی مطمئن نہ ہوتے ؟ اُس وقت کے لیے تو یہ کہ سمجھئے کہ جذبات تازہ تھے۔ اور ولولے موجزن۔ آج اتنا زمانہ گزرنے کے بعد وقت کے اتنے فاصلہ کے بعد بھی، ان اعلانات ان بیانات کو پڑھ کر، فیصلہ کیجئے کہ محمدؐ علی کا اعتماد کیا کسی سادہ دلی کا، عجلت پسندی کا، بے احتیاطی کا،

نتیجہ تھا؟ ابھی کل ایک ہفتہ ہوا، محمد علی نے یہ تار خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت سلطان کو دلوایا تھا:۔

"سالانہ خلافت کانفرنس...... آپ کو مدینہ منورہ اور جدہ میں پرامن داخلہ پر دلی مبارکباد دیتی ہے...... تطہیر حجاز کا شکریہ ادا کرتی ہے.... ہم موتمر کی شرکت کے لئے تیار ہیں۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ آیا اگلی حج کا زمانہ اس کے لئے موزوں ہوگا ہم اپنے اس ریزولیوشن پر قائم ہیں جو اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ کو بھیجا گیا تھا ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر کے مکتوب میں اس سے اتفاق کیا ہے"

یہ تار ۲۹ جنوری کو روانہ ہوا تھا۔ اور کو سلطان کے اعلان بادشاہت کا وہ تار آگیا، جو سب سے اوپر درج ہوا ہے۔ کل ایک ہفتہ کے اندر یہ قلب ماہیت' یہ انقلاب روزگار۔ ع

گویا کہ دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ!

ہا! چاہا کیا تھا' ہوا کیا سوچا کیا تھا! ظاہر کیا ہوا۔ مانگا کیا تھا! ملا کیا! دعائیں دنوں کو رو رو کر اور راتوں کو گڑگڑا کر گڑگڑا کیا کی تھیں! اور وہ پوری کس طرح ہوئیں الٹ ہی دی گئیں!۔۔۔ دعائیں اس کے قبل بھی محمد علی کی قبول ہی کونسی ہوئی تھیں؟ بغداد کی آزادی کے لئے سارے عراق کی آزادی کے لئے' بیت المقدس کے لئے' سارے فلسطین کے لئے' شام کے لئے مصر کیلئے' ہندوستان کیلئے' ان سب کی آزادی کیلئے' بقائے خلافت کیلئے' کونسی دعائیں چھوڑ رکھی تھیں؟ اپنی والی کوئی بات خشوع و تضرع میں اٹھا رکھی تھی! نصیب میں کسی بھی دعا کی مقبولیت لکھا کر لائے تھے؟

حکمت کے تھاہ سمندر کی گہرائیوں کو کون ناپ سکا ہے؟ حکمت کاملہ کے دفتر بے پایاں کی شرح کون تیار کر سکا ہے؟ حکیم مطلق کے کاروبار کے رمز و اسرار کا احاطہ کون کر پایا ہے؟ یعقوب علیہ السلام پیمبر اور پیمبر برحق پیمبر کے باپ پیمبر کے بیٹے، پیمبر کے پوتے پیمبروں کے چہیتے پھر کیا انھیں غم دلبند میں برسوں رلایا، تڑپایا، کلپایا نہیں گیا۔؟ یوسف علیہ السلام، شاہ بھی اور شاہزادے بھی حسن و جمال کے پتلے اول دن سے محبوبوں کے محبوب، کیا کنوئیں میں ڈھکیلے

نہیں گئے کیا کنوئیں کی تہ میں، تہ بہ تہ تاریکیوں میں ایک مدت نہیں گزاری، غلام ہو کر نہیں بکے؟ جیل میں چوروں اور قزاقوں کے ساتھ بند نہیں کئے گئے؟ نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام، یونس علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام ان کی آزمائشیں کیا کیا نہیں ہوئیں؟ ان کی دعائیں، دل سے نکلی ہوئیں دعائیں۔ خدا جانے کتنی اور کیسی کیسی پھر کر نہیں لوٹا دی گئیں۔ عجائب کاروبار میں اور عجیب سے بڑھ کر عجیب اسرار جہاں بڑوں بڑوں کے ساتھ معاملات یہ ہوں وہاں چھوٹوں کا ذکر ہی کیا؟ جہاں آفتاب اور ماہتاب ماند پڑے جا رہے ہوں، وہاں شمع کافوری یا موم بتی اپنی بے رونقی اور اپنے پھیکے پن پر زبان کیا کھولے۔

کہیں عوام تک یہ دلدہی، کہ

ادعونی استجب لکم مجھے پکارے جاؤ مجھ سے دعا کئے جاؤ میں سب ہی کی درخواستیں منظور کرتا رہتا ہوں

اور کہیں خواص تک کو اس ادب کی تعلیم، کہ

فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجاہلین۔ اس چیز کی درخواست ہی ہم سے نہ کیا کرو جس کی تمھیں خبر نہیں تمھیں نصیحت کیجاتی ہے کہ ایسی درخواست کر کے نادانوں میں نہ شامل ہو۔

کسی تر دہٴ بشارت یوں سنایا جاتا ہے ؎

چوں چنیں خواہی خدا خواہد چنیں — می دہد یزداں مراد متقین
گفت حق گر فاسقی و اہل صنم — چوں مرا خوانذی اجابتہا کنم
شاد باش و فارغ و ایمن کہ من — آں کنم با تو کہ باراں با چمن

اور کسی کو درس ہدایت ان الفاظ میں ملتا ہے ؎

حق بفرماید نہ از خواری او ست — عین تاخیر عطا یاری او ست
نالہٴ مومن ہمی داریم دوست — گو تضرع کن کہ ایں اعزاز اوست
خوش ہمی آید مرا آواز او — واں "خدایا" گفتن واں راز او

محمد علی کے دل پر یہ خبر پا کر کیا گزر گئی ہوگی امید و تمنا سارا قلعہ یک بیک دھم سے گرتا ہوا دیکھ قلب پر بجلی سی گر پڑی ہوگی، جس کی حمایت میں بڑے بڑے پرانے دوستوں،

اور رفیقوں کا ساتھ چھوڑنا پڑا تھا، حسرت موہانی کو، مولٰنا عبدالماجد بدایونی کو، فرنگی محل کو چھوڑنا پڑا تھا جس کیلئے اپنے پیر و مرشد تک سے جنگ پر آمادہ ہو جانا پڑا تھا، یہ وار اس کے ہاتھ سے ہوا! قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے کہ عین جس وقت محمد علی اپنے مرشد سے جنگ پر آمادہ ہوئے ٹھیک اسی وقت پر یہ بم کا گولہ آکر گرا! انکا خون دل کی روشنائی سے لکھا ہوا مضمون تقاضائے وفا ۱۳ رجنوری کے ہمدرد میں نکلا، صـ ۵۹۳ پر ٹھیک اسی تاریخ کے پرچہ میں نہ ایک دن آگے نہ ایک دن پیچھے، صـ ۵ پر یہ ابن سعود کی اعلان ملکیت والی خبر موجود! —— فطرت مسکرا رہی کہ یہ بے خبر بندہ اعلان جنگ کس سے کر رہا ہے، اور جنگ کرنی کس سے پڑیگی! اپنا حریف و مقابل اسوقت سمجھ رہا ہے اور نکلیگا کون ہمدرد میں خبر کے گرد سیاہ چوکھٹا سب نے دیکھا، ہمدرد کے مالک اور چیف ایڈیٹر کے صفحۂ دل پر جو غم و الم خون دیا اس کے سیاہ بادل چھا کر رہے انکے دیکھنے کے لئے کوئی آلہ کہاں سے لایا جائے؟ ہمدرد کا کام محض خبر دیدینا نہ تھا۔ رہنمائی کرنا بھی تھا قلب مضطرب کہ خبر دینے کیساتھ ہی پورا حق رہنمائی بھی ادا کر دیا جائے لیکن ضوابط اور آئین مجالس کی پابندیاں زنجیر پا، خبر کیساتھ یہ مختصر نوٹ بھی نکلا:-

”ہمیں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد صدر خلافت کمیٹی کی اجازت کا انتظار رہی جوں ہی اجازت آئی انشاءاللہ ہمدرد اور دیگر قومی اخبارات میں تمام اطلاعیں شائع کر دیجائیں گی جو اب تک دفترِ خلافت کو موصول ہوئی ہیں، جس سے ہر شخص سمجھ لیگا، کہ بحمداللہ خلافت کمیٹی بغیر کسی تذبذب یا تزلزل کے برابر اسی مسلک پر قائم رہی ہے جو اُسنے غور و خوض کے بعد ۸ اکتوبر ۲۴ء کو اس مسئلہ پر اپنا مسلک قرار دیا تھا“

مشہور تھا کہ محمد علی اور مولٰنا ابوالکلام صاحب میں صفائی نہیں اس عام شہرت کی صحت و عدم صحت پر گفتگو کا یہ موقع نہیں، یہاں کہنا بس اتنا ہے کہ محمد علی شدید تاثر کی حالت میں بھی آئین و ضابطہ کے حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتے تھے غصہ میں کتنے ہی بھرے ہوں زبان سے الفاظ کی جگہ چاہے آگ کے شعلے ہی نکل رہے ہوں آئین و ضابطہ کے خلاف کسی طرح نہیں جاتے تھے کانپور خلافت کانفرنس میں مجلس مرکزی سے وہ اور دوسرے خلافت کمیٹی کے تڑوانیکے انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی روادار نہ تھے، صرف کثرت رائے سے شکست دینا چاہتے تھے، وہی صورت اسوقت بھی پیش آئی جدہ کے تار سے نہایت مضطرب، چاہتے تھے فوراً دل کھول کر سب کچھ ہمدرد میں لکھ ڈالیں۔ ہمدرد و خلافت کا نہیں ان کا اپنا ذاتی اخبار تھا پھر بھی تقاضائے احتیاط اس درجہ تھا کہ صدر خلافت کی اجازت کا انتظار دل پر جبر کر کے کرتے رہے!

سنہ ۱۹۲۶ء فروری یا مارچ کا مہینہ ہے اور محمد علیؒ کی مخالفت "غیر مقلدہ" مقلدین ابن سعود سے خوب زوروں پر ہے۔ سب سے پیش پیش اخبار زمیندار ہے جس کے ایڈیٹر مہر صاحب ہیں۔ مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ دہلی میں حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور کے مکان پر ہو رہا ہے۔ محمد علیؒ باوجود علالت شدید و ضعف کے شریک ہیں، اور کوچ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ایک تجویز پیش ہوتی ہے، گرما گرم بحث و مباحثہ کے بعد، صدر (مولانا ابوالکلام) ووٹ لینے کا حکم دیتے ہیں "پنجابی ٹولی" (بہ زبان محمد علیؒ) نے فیصلہ سے ناخوش ہوکر "واک اوٹ" کرنا چاہا۔ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خاں صاحب اُٹھے، اور ان کے صاحبزادہ اختر علی خاں صاحب اور زمیندار کے نفس ناطقہ مہر صاحب۔ ادھر ان حضرات کا اٹھنا تھا کہ ادھر بیمار و ناتوان محمد علیؒ بھی جھٹ اپنے کوچ پر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ اور بیساختہ فرماتے ہیں کہ غضب ہوگیا۔ باپ بیٹے، روح القدس، تینوں خفا ہوگئے! ـــــ یہ ایک نمونہ ہے محمد علیؒ کی برجستہ گوئی اور حاضر دماغی کا۔ غصہ میں بھرے ہوئے ہوں، رنج میں ڈوبے ہوئے ہوں ضعیف و مضمحل ہوں، کچھ ہی ہو۔ کسی حال میں ہوں، ذہانت کسی وقت ساتھ نہ چھوڑتی، اور لطیفہ گوئی سے کسی وقت نہ چوکتے۔ غصہ میں عقلیں ماند پڑ جاتی ساری دنیا کی دیکھیں، محمد علیؒ کی ذہانت ایسے اوقات اور چمک جاتی، اور فی البدیہہ وہ سوجھ جاتی، جو دوسروں کو غور کے بعد بھی نہ سوجھ پڑتی ـــــ زمیندار ابھی کل تک مسئلہ حجاز میں ہمدرد کا سب سے بڑا حلیف تھا۔ اب وہی سب سے بڑا حریف بھی بن گیا۔ اور مخالفت کے ہیجان میں حدود کا خیال کس کو رہا ہے؟

خلافت کمیٹی محمد علی کی رہنمائی میں ابتک اپنے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھی، اُسے نہ وہابی حنفی قضیہ سے دلچسپی، نہ قبہ نوازی و قبہ شکنی سے سروکار، اُس کے پیش نظر تو صرف یہ مقصد اعظم تھا کہ حجاز کسی طرح اغیار کے تسلط سے آزاد، اور جملہ فرق اسلامی کے لئے کھلا ہوا رہے۔ کسی خاص نسل و خاندان کی ذاتی یا موروثی ملکیت اسی لئے اُسے بری طرح کھٹک رہی تھی، اور اسی کے خلاف وہ سلطان سے عہد و پیمان لے چکے تھے۔ اعلان

ملکیت کے بعد وسط جنوری میں، مولانا ابوالکلام صاحب صدر جمعیتہ خلافت کی طرف سے سلطان کے نام حسب ذیل تار روانہ ہوا:-

"ہم متحیر ہیں، کہ اخبارات اہل حجاز کے آپ کو بادشاہ منتخب کرنے کی اور نیز آپ کے اُس کو قبول کرنے کی خبریں شائع کر رہے ہیں۔ ہم متوقع تھے کہ حکومت حجاز کے مستقبل کا فیصلہ آنے والی موتمر کے ذریعہ سے ہوگا جس کو آپ نے دعوت دی ہے، ہم ان غیر متوقع واقعات کے متعلق جس نے فکر پیدا کر دی ہے۔ مستند اطلاع کا تشویش کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔

الفاظ اس سے زیادہ نرم و مودبانہ اور کیا ہو سکتے تھے؟ لیکن لفظ کی نرمی کہیں حقائق کی سختی کو، اور عبارت کی شیرینی کہیں واقعات کی تلخی کو بدل سکتی ہے؟ کس ملک نے آج تک دلائل کی قوت کے سامنے اپنے لشکر جرار کو بے ہتھیار کر دیا ہے؟ کس فرمانروا نے تاریخ میں کہیں بھی، انجمنوں اور کمیٹیوں کے ڈر سے تخت و تاج سے دستبرداری کی ہے؟ عام فطرت بشری کہیں بھی اتنی متواضع ثابت ہوئی ہے؟ —— سلطان میں حجاز میں جو کچھ کیا، اُس سے اس ڈائری کو واسطہ کیا؟ یہاں تو ذکر اس کا ہے، کہ حالات کا اثر، محمد علیؒ پر کیا پڑ کر رہا —— محمد علیؒ ابھی کل تک وہابی تھا۔ تبہ شکن تھا۔ بے ادب تھا۔ گستاخ تھا، اب وہی محمد علیؒ یک بیک بدعتی تھا۔ قبر پرست تھا، تبرک نواز تھا، تطہیر حجاز کا دشمن تھا!

تو کہے گبر مجھے، گبر مسلمان مجھ کو!

سلطان کی موافقت و مخالفت دونوں ہندوستان کے بیشمار انسانوں نے کی اچھے اچھے اکابر نے سرگرمی کے ساتھ، دونوں طرف حصہ لیا، لیکن یہ امتیاز محمد علیؒ ہی کے حصہ میں آیا، کہ پہلے بلا میں سب نے انھیں کو وہابیوں کا سالار قرار دیا، اور اب کی بھی سارا نزلہ انھیں پر گرا، اور مخالفین کے کیمپ میں رجعت پسندوں کے سب سے بڑے سرغنہ یہی ٹھہرے یہ سزا تھی حق گوئی اور حق شناسی کی یہ صلہ تھا اس عالم میں بجائے اشخاص پرستی کے اصول

پر قائم و ثابت رہنے کا! خود فرمایا کرتے تھے کہ جو کل ابن سعود کے ساتھ تھے، وہ آج بھی ابن سعود ہی کے ساتھ ہیں۔ جو کل حق کے ساتھ تھے، وہ آج بھی بحمداللہ حق ہی کے ساتھ ہیں!

دن اور تاریخ تو یاد نہیں، اور مہینہ میں بھی خوب ذہن میں نہیں، شاید سال کی پہلی سہ ماہی ختم پر تھی، کہ مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کی مجلس عاملہ دونوں کے جلسے دہلی میں ہوئے۔ ہنگامۂ مخالفت عین شباب پر۔ جلسہ سے ایک ہی روز دو قبل ہمدرد میں ایک مضمون، پنجابی "سعودیوں" کے جواب میں محمد علی کے قلم سے نکلا، ایک جگہ ایک فقرہ ایسا آگیا تھا۔ جس سے پنجاب کے ایک مشہور لیڈر پر ذاتی تعریض صاف نکل سکتی تھی۔ جلسہ صبح کو ہے، شام کو میں دہلی پہونچا، محمد علیؒ کئی کئی بیماریوں میں مبتلا، صاحب فراش، وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے، اور میں پاس بیٹھ گیا۔ دو ہی چار باتوں کے بعد اس مضمون کا ذکر چھیڑ کے، میں نے کہا کہ خیر، اور تو سب ٹھیک تھا۔ لیکن فلاں فقرہ تو فلاں پر کھلا ہوا ذاتی حملہ ہے۔ محمد علی نے حیرت سے پوچھا "یہ کیسے، اس میں ذاتی حملے کی کیا بات ہے؟ میں نے مختصر تشریح کی، گھبرا گئے۔ کہا، "مجھے واللہ اس تلمیح کا اب تک علم نہ تھا" پھر حسرت و تاسف لیسا تھ کہا، کہ اب کیا ہو سکتا ہے، مضمون تو چھپ چکا، تردید کروں، تو بات اور زیادہ کھلتی ہے۔ جو اب تک میری طرح نہیں جانتے وہ بھی جان جائیں گے، ——

یہ تھی "ضدی" محمد علیؒ کی انصاف پسندی۔ اپنی غلطی واضح ہو جانے کے بعد میں نے ایک موقع پر بھی محمد علی کو ہٹ کرتے نہیں پایا۔ اور یہی وصف امتیازی اُن کے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم فرنگی محلی میں بھی تھا —— مجلس عاملہ کا جلسہ دوسرے دن شام کو تھا۔ پانچ سات ارکان کا ایک مختصر سا مجمع انھیں میں ایک رکن، پنجاب کے اہل حدیث گروہ کے ایک مشہور مقتدا تھے (اُن کی یہ حیثیت اگلی سطریں پڑھنے سے قبل ذہن میں محفوظ کر لیجئے) تذکرہ اُسی مضمون کا چھیڑا۔ اُن صاحب نے ہمدردی اور ہوا خواہی کے لہجہ میں کہا کہ زمیندار کی زبان درازیاں بالکل مسلّم۔ لیکن آپ بھی تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے

ابھی اسی مضمون کے اُس فقرہ کا آخری کیا مطلب تھا؟ محمد علیؒ نے کہا" میں قرآنِ مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اُس وقت تک اس تلمیح کی خبر نہ تھی۔ یہ تو کل شام کو فلاں شخص سے معلوم ہوا" وہ ممبر صاحب ایک سنجیدہ ذی علم بزرگ تھے، بات کاٹ کر بولے کہ قرآن کی قسم کھانا جائز نہیں ، محمد علی کے جواب میں دو چار لمحوں کا بھی توقف نہ ہوا بجلی کی سی سرعت سے چمک کر بولے :" اچھا تو قرآن کو جانے دیجئے۔ حدیث کی قسم سہی اس جواب کا کسی کو شان و گمان ہی نہ تھا۔ کوئی مسکرادیا، کوئی ہنس پڑا، لطف سب نے لیا!

سنہ ۲۴ء تک میرا تعلق کسی خلافت کمیٹی سے نہ تھا۔ محض ایک تماشائی کی طرح تھا۔ سنہ ۲۵ء میں پہلی بار محمد علی کی رفاقت کھینچ کر اس حلقہ کے اندر لائی، اکتوبر سنہ ۲۵ء میں مرکزی کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔ اور احباب لکھنو (خصوصاً چودھری خلیق الزماں) نے یک بیک صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹیوں کی صدارت کا بار زبردستی سر پر رکھ دیا۔ اُس وقت تک مرکزی کے صدر حکیم صاحب مرحوم تھے، ان کے بعد جانشینی مولانا ابوالکلام کے حصہ میں آئی۔ سنہ ۲۶ء میں مرکزی کے جلسے بہ کثرت ہوئے۔ اکثر دہلی میں، اور دو ایک لکھنو میں، سب میں شرکت کا اتفاق ہوا، اور اندر سے اس پر قوت اور اسلامیانِ ہند کے عظیم الشان ادارہ کی کارفرمائیوں کے دیکھنے کا موقع ملا۔ محمد علیؒ کی حیثیت ضابطہ سے بس ایک ممبر کی تھی نہ صدر تھے، نہ سکرٹری، نہ اور کسی خاص عہدہ کے مالک لیکن عملاً ساری مجلس کی رہنمائی کی باگ انھیں کے ہاتھ میں تھی، بلحاظ اصول بھی اور باعتبار فروع بھی۔ یعنی جمعیتہ کا عام مسلک (پالیسی) بھی وہی متعین کرتے تھے، اور پھر اس کے بڑے بڑے جزئیات بھی انھیں کے چلائے ہوئے چلتے تھے، یہ نہیں کہ دوسروں کی سنتے نہ ہوں۔ اور یہ تو اور بھی نہیں کہ لوگ ان کی رائے کی مخالفت نہ کرتے ہوں، سر جھکائے ہوئے چپکے سے ان کی ہر بات کو مان ہی لیتے ہوں، جی نہیں، یہ کہاں ؟ اس کے برعکس مخالفت تو اُن کی بات بات پر ہوتی تھی، اور رکاوٹ تو انھیں ہر ہر قدم پر پیش آتی

تھی، لیکن اب اس سے اُن کی قوت استدلال کا کرشمہ سمجھئے یا اُنکی حق گوئی و دیانت کا ثمرہ کہئے، یا اون کی شخصیت و وجاہت کا اثر قرار دیجئے، بہر حال ہوتا بالاخر وہی تھا جو اون کی رائے ہوتی، اور تقریبًا ہر موقع پر رہنمائی اُنھیں کی صحیح قرار پاتی۔ جمعیۃ خلافت کا روح رواں مولانا شوکت علی کو سمجھا جاتا ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، اور ضابطہ سے بھی وہی اُس کے سکرٹری ہیں۔ لیکن اسی ۱۹۲۶ء میں مرکزی کے ایسے جلسے بھی ہوئے۔ جن میں شوکت صاحب شرکت سے معذور تھے (شاید بر ہما گئے ہوئے تھے) اس پر بھی جلسہ میں کچھ بہت زیادہ فرق نہ محسوس ہونے پایا۔ بخلاف اس کے محمد علیؒ کے بغیر، مرکزی کا کوئی سا بھی جلسہ ناقابل عمل تھا، شاید ناقابل تصور تھا بغیر اون کے ہر محفل سونی، ہر جلسہ میں سناٹا۔ جلسوں میں عمومًا دیر کو پہونچتے۔ اتنی دیر تک ایک اداسی اور افسردگی سی چھائی رہتی، ادھر وہ آئے اور ادھر وہی رونق، وہی تازگی، وہی چہل پہل، پھر پیدا ہو جاتی، زبان پر قابو، دل کے جذبات نے باقی کب رہنے دیا تھا، جو کچھ دل میں ہوتا، بلا لحاظ مجلس، وقار مجلس، وآداب مجلس، فورًا سب زبان پر آجاتا۔ وقت سب سے بڑھ کر صدر جلسہ کو پیش آیا کرتی۔ نہ ایسی تقریروں کی اجازت دیتے بنتی۔ نہ محمد علی کو روکتے ہی بنتی۔ پر یہ اثر و اقتدار بھی خود بخود نہیں پیدا ہو گیا تھا۔ محمد علیؒ تحریکِ خلافت کے پیچھے اُس کے نظام مجلسی کے پیچھے اپنے کو فنا کئے ہوئے تھا۔ کانپور کے جلسۂ سالانہ میں دیکھا۔ لکھنؤ کے جلسہ سالانہ میں دیکھا دہلی کانپور اور لکھنو میں مرکزی جلسوں میں بار بار دیکھا، کہ بعض دوسرے بڑے بڑے ذمہ دار اصحاب ادنیٰ سے ادنیٰ عذر پر (بلکہ بعض تو بالکل بلا عذر) جلسہ کی شرکت صاف ٹال جاتے۔ محمد علی کے لئے اس کی کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔ بیمار ہوں یہاں تک کہ صاحب فراش ہوں، یا تو اپنے گھر ہی پر جلسہ طلب کراتے، اور یا جلسہ گاہ تک کسی طرح پہونچ کر، پھر وہاں کوچ پر لیٹ جاتے۔ خود بیمار ہوں۔ محبوب ترین لڑکیاں بیمار ہوں۔ شدید سردی میں آدھی رات کا وقت ہو، سخت گرمی میں ٹھیک دوپہر کا وقت ہو کتنے ہی مشغول ہوں، اُس کے لئے وقت نکال ہی لیتے، پیسہ پاس

نہ ہو، قرض وام کرکے، ریل کا کرایہ دیتے، بہر حال پہونچتے ضرور، یہ اخلاصمندی کہیں بالا بالا جا سکتی تھی؟ اس کا اثر کیسے دوسروں پر نہ پڑتا؟ موافقین کو چھوڑیئے، مخالفین تک پر کیسے نہ پڑتا؟

فرنگی محل اب ساتھ تھا۔ گو مولانا عبدالباری کے اٹھ جانے کے بعد فرنگی محل خود ایک جسدِ بے روح تھا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی، حسرت موہانی اور بہت سے اور بچھڑے ہوئے دوست اب پھر آملے تھے، لیکن اس کے مقابلہ میں خدا جانے کتنے اور جڑے ہوئے دل اب ادھر سے ٹوٹ بھی چکے تھے۔ دنیا قضیۂ نجد وحجاز کو عقاً کی جنگ بنائے ہوئی تھی، محمد علیؒ نے لاکھ سمجھایا، ملکیت و جمہوریت کی بحث کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، پس گھوم پھر کر وہی وہابیت اور قبوں کا قصہ محمد علی نے سلطان کا ساتھ یہ سمجھ کر دیا تھا، کہ وہ جمہوریۂ اسلامی قائم کریگا۔ اب جو ساتھ چھوڑا، وہ اس لئے کہ یہ توقع باطل ثابت ہوئی۔ پہلے ہندوستان کے "اہلحدیث" خوش ہوئے اور صوفی ناراض، اب صوفیوں کی خوشی کی باری تھی، اور اہلحدیث کی خفگی کی۔ اس وقت خفگی میں سب سے پیش پیش پنجاب تھا۔ مرکزی کے جلسوں میں ارکانِ پنجاب خاصی بڑی تعداد میں متحد ہو کر آئے۔ اور رزم میں اچھا خاصہ لطف میدان رزم کا آجاتا، ایک روز جلسۂ مرکزی سے قبل شام کو دہلی پہونچا۔ محمد علی پلنگ پر لیٹے ہوئے بیماری سے کراہ رہے تھے، پنجاب کے ایک مشہور لیڈر سے نہایت درجہ بیزاری کا اظہار اخباروں میں کر چکے تھے، میں نے چند ہمخیالوں کو ساتھ لے کر ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اتنی سختی مناسب نہیں" خیر مجھے تو جواب کچھ یوں ہی سا سرسری دیا لیکن میرے ہم آواز ایک مقدس اور خود محمد علی کے نزدیک بھی بہت محترم عالم دین بھی تھے۔ بس اُن پر محمد علی ابل پڑے۔ جوش میں آکر لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور بولے کہ مولانا آپ نائب رسول ہو کر مجھے نرمی کا مشورہ دے رہے ہیں۔! میں مداہنت برتوں! قوم کے غداروں کے ساتھ! کیا آپ نے بارہا اپنے وعظوں میں حضرت عمر فاروق کی یہ مثال

نہیں بیان فرمائی ہے کہ انھوں نے عین معرکۂ جہاد کے وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے سپہ سالار خالد کو ایک دم سے معزول کر دیا؟ کیا عمر فاروق کی یہ بیجا سختی تھی؟ میں مرتے مرتے مرجاؤں گا، لیکن ایک شخص کو کسی مصلحت سے بھی، قومی غداری کے بعد معاف نہیں کروں گا۔ سب میرا ساتھ چھوڑ دیں، میں نے ساتھیوں کے بھروسہ پر نہیں، اللہ کے بھروسہ پر کام شروع کیا ہے، اُسے منظور ہوگا۔ تو وہ نئے ساتھی پیدا کر دے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کسی وقتی مصلحت سے بھی مداہنت برتنے لگوں۔ جسم کا جو عضو فاسد ہو جائے، اُسے کاٹ ڈالنا ہی بہتر ہے" ——— محمد علی کی رائے کی تصویب یہاں مقصود نہیں، یہاں دکھانا صرف ان کی نیت ہے، اُن کے اندر جو جذبہ ہر وقت کارفرما رہتا تھا، صرف اُسے کھول کر دکھا دینا ہے، جو ہر وقت اس غم اور ان فکروں میں گھلتا رہتا ہو، وہ کب تک جی سکتا تھا؟ خلاف توقع اس کا مرنا نہیں، اُس کا جینا تھا!

ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا، دسترخوان پر متعدد علماء و بزرگان ملت سب مخلص و بے تکلف جمع تھے۔ مسئلہ تصویر کشی کا چھڑا۔ محمد علی مسائل فقہ میں حنفی تھے، لیکن حق اجتہاد اپنے لیے، اور ہر مسلمان کے لیے بھی محفوظ رکھتے تھے کہا کرتے تھے، کہ کسی ماہر خصوصی (اسپشلسٹ) کے معتقد و قائل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اُسے محفوظ عن الخطا سمجھ لیا جائے، یہ تقلید، تقلید جامد ہے۔ امام صاحب بہت بڑے عالم، بہت بڑے مجتہد، بڑے زیرک و دانا، عاقل و فہیم تھے، لیکن کم از کم احتمال و امکان تو اس کا ہے کہ ۹۹۹ مسائل میں انھیں کا اجتہاد صحیح ہو اور ہزارویں میں مجھ جیسے عامی کا۔ معصوم و غیر خاطی ہونا تو صرف رسول کی شان ہے، خیر اس عقیدہ تک تو غنیمت تھا، لیکن عملاً بھی متعدد مسائل میں اپنی ذاتی تحقیق پر علماء و فقہاء کے علی رغم، کاربند تھے۔ انھیں مسائل میں ایک مسئلہ تصویر کا تھا۔ تصویروں کے بڑے شایق، اور شایق ہی نہیں نقاد و مبصر بھی تھے، "آرٹ" کی اس شاخ (مصوری) پر ایسی مبصرانہ تنقیدیں کرتے کہ اچھے اچھے ماہرین فن پھڑک اُٹھتے۔ سب کمروں میں تصویریں لگا رکھی تھیں، لیکن ڈرائنگ روم تو پورا نگار خانہ تھا۔ یہاں تک کہ بعض تصویریں نیم عریاں بھی ———

دوسرے لوگ "صاحبانہ" مذاق کے ایسی تصویریں بڈروم (خواب گاہ) میں لگاتے ہیں، محمد علی کے ہاں چُرانے چھپانے کا گزر کہاں۔ عیب و ہنر جو شے بھی تھی، بالکل کھلی ہوئی اور علانیہ ——— میں جب جاتا، ایک جھڑپ اسی مسئلہ تصاویر پر ہوتی۔ فقہاء کے دلائل اور اُصول فقہ کے باضابطہ مطالعہ کا کبھی موقع ملا نہ تھا، اس لئے میرے "تقلیدی" معروضات کے جواب میں، محض اپنی ذہانت سے گڑھ گڑھ کر کچھ نہ کچھ "اجتہادات" ہی کرتے رہتے اور کبھی میری نہ مانتے، یہ حال تنہا کچھ مجھ عامی کے ساتھ نہ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ علماء سے باوجود اُن کے علم و فضل کے اعتراف کے یہی معاملہ رکھتے۔ ہاں تو جس روز دسترخوان پر یہ منتخب مجمع تھا، میں نے چھیڑ کر یہی مسئلہ نکالا، گفتگو بڑھی۔ محمد علی سب سے مقابلہ کر رہے تھے، ایک ایک کو جوابات دے رہے تھے۔ میں نے عرض کیا، کہ "جائز ناجائز، مباح و حرام کی بحث چھوڑیئے، صرف اس پہلو کو لیجئے، کہ جن کی آپ دل سے عزت کرتے ہیں، انھیں آپ کے اس فعل سے اذیت ہوتی ہے، بس اُن کے رفع اذیت ہی کے خیال سے اسے ترک کر دیجئے"۔ کہا کہ "اتنی خاطر تو مجھے صرف مولانا حسین احمد صاحب کی عزیز ہے" (ان سے نہایت درجہ خلوص، محبت، اعتقاد و اعتماد اُس وقت تک تھا، جیل میں اُن کی زندگی کا مشاہدہ کر چکے تھے، اس سے بہت متاثر تھے) میں نے کہا "اچھا انھیں کی خاطر سے سہی"۔ فرمایا "ہاں منظور، بشرطیکہ وہ اپنی زبان سے بھی یہ کہدیں، دلائل وغیرہ نہ پیش کریں، ورنہ میں پھر جواب دینا شروع کر دوں گا۔ صرف اتنا کہدیں کہ میری خاطر سے انھیں اُتار دو"۔ حضرت مولانا کو اس کار خیر، یا کلمۂ خیر میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ فرمادیا۔ اور بیسیوں تصویریں، صدہا بلکہ شاید ہزارہا کی قیمت کی، اُسی دن اتر گئیں! ——— یہ نہ پوچھیئے کہ کس دل سے محمد علی نے انھیں اُتارا، اور کتنا شدید مشاہدہ اُن کے نفس کو کرنا پڑا، لیکن بہرحال تھے بات کے پکے، زبان دے چکے تھے، جو کہا تھا، پورا کر دکھایا۔

ہم عقیدگی کی بنا پر، سلطان ابن سعود کے حامیوں اور موافقین کی ایک اچھی خاصی جماعت ہندوستان میں پیدا ہو گئی تھی ——— اور ملوک و سلاطین کو تو ہر دَور میں حامی

و موافقین ہی ملتے رہے ہیں ــــــــ ٹھیک اسی طرح جیسے کچھ روز پیشتر اختلاف عقائد کی بنا پر مخالفین ابن سعود کی بڑی کثیر جماعت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسوں میں اب یہی مسئلہ سب سے پیش پیش اور سب پر غالب رہتا۔ جو ارکان، قبہ نواز تھے اُن میں سے اکثر تو الگ ہی ہو چکے تھے، اور بعض عملاً کنارہ کشی اختیار کئے ہوئے تھے، جو قبہ شکن تھے اب اُنھیں کا دَور دَورہ تھا، اور وہ زور و قوت کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہے تھے، ان کی علمبرداری کا شرف، خاک پاک پنجاب کے حصہ میں آیا، محمد علی کی زبان پر ان حضرات کے لیے ایک دلچسپ نام تھا، غیر مقلدین، مقلدین ابن سعود" اسی لقب سے اکثر اپنی تحریروں تقریروں میں انھیں یاد کرتے۔ اس گروہ کا کہنا یہ تھا کہ سلطان سے بہتر حکمران حجاز کو اور کون مل سکتا ہے، اس قدر متبع شریعت، ایسا متمسک بالکتاب والسنۃ، ایسا قامع بدعات! محمد علی کا جواب ہمیشہ یہ ہوتا تھا، اور اس دعویٰ کی تردید نہ اُس وقت کسی کے کیے ہو سکی تھی، نہ آج تک ہو سکی ہے کہ" تمھارا قامع بدعات، خود ہی سب سے بڑی بدعت میں مبتلا ہے، اور وہ بدعت ملکیت، بادشاہت، کی ہے، وہ ادنیٰ ادنیٰ بدعتوں کو مٹاتا ہے، جن کا بدعت ہونا ہی معرض بحث میں ہے اور جو بالکل مسلّم اور اُن سب سے کہیں بڑا بدعت ہے یعنی غیر شوری، غیر جمہوری، شخصی و موروثی حکومت قاہرہ، اسے زندہ کیے ہوئے ہے۔ حجاز سارے عالم اسلام کا ہے اور اس کی خدمت کا حقدار صرف وہی ہے، جو سارے عالم اسلام کے مشورہ و انتخاب سے، اسلامیانِ عالم کے نائب (نمایندہ کی حیثیت سے تخت نشیں ہو، اور فرقہ ورانہ غلو سے خالی الذہن ہو کر سارے عالم اسلام کے لئے یکساں سہولتیں بہم پہونچائے۔ اس کے خلاف کرنا، تمسک خلفائے راشدین کی سنت سے نہیں، بلکہ قیصر و کسریٰ کی سنت سے کرنا ہے"

بیت اللہ، اور روضۂ رسول ؐ کی حاضری کی جو تڑپ محمد علی کے دل میں تھی، اسے یا تو وہ خود جانتے تھے، یا عالم الغیب۔ لیکن بہ ظاہر یہ بات لوگوں کو تعجب میں ڈالنے والی تھی، کہ بہ ایں عشق و محبت، یہ شیدائے اسلام، ابھی تک حج و زیارات سے

مشرف نہیں ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں جیل سے رہائی کے بعد، بھوالی میں میں نے کھل کر عرض کیا تھا، جواب ایک آہ سرد کے ساتھ حسرت ناک لہجہ میں یہ ملا تھا کہ "کیا جاؤں۔ کچھ تو وہاں کے لیے کام کر لیا ہوتا۔ کیا منہ لے کر جاؤں۔ خانہ خدا اور اس پر اغیار کا قبضہ! ذرا آزاد ہولے، جب تو جانے کا کچھ لطف بھی ہے" ——— آزادی حجاز کا جنون عمر بھر کا جنون رہا ——— "تطہیر حجاز" کی خبریں اب حدِ تواتر کو پہونچ چکی تھیں۔ کم از کم برطانیہ کے حلیف، شریفیوں کی حکومت تو اب اٹھ ہی چکی تھی۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں محمد علی حج کا تہیہ کر بیٹھے۔ وسط ماہ میں مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس نے موتمر کے لیے اپنے چار نمائندوں میں سے ایک محمد علی کو بھی منتخب کیا ——— پنجاب کے ۱۴۔ ۱۵ حضرات متفق ہو کر آئے تھے، اور وہ سب کے سب اس وقت محمد علی کے شدید ترین مخالف تھے۔ اس لیے احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید محمد علی کے انتخاب میں دقت ہو (کمیٹی کے کل ارکان شاید ۵۴ سے زائد نہ تھے) لیکن انتخاب بڑی اکثریت کے ساتھ ہوا ——— اور محمد علی نے اپنے اور اپنے بھائی کی طرف سے اعلان کیا کہ چونکہ ہم لوگ پہلی مرتبہ فریضۂ حج ادا کرنے جا رہے ہیں، اس لیے اپنے مصارف ہم خود ہی ادا کریں گے، خلافت کمیٹی سے نہ لیں گے ——— یہ وہ محمد علی تھا، جسے بعض خوش ظرفوں نے پیسہ کا حریص بھی بتایا ہے! ——— مئی میں وفد روانہ ہوا، اور اگست میں واپس آیا۔ وہاں جو کچھ محمد علی کو دیکھنا پڑا خدا جانے ان سے دیکھا کیوں کر گیا۔ ہر طرف ملوکیت کی قہرمانی، ہر سمت نجدیت کی کرختگی۔ قبور مسمار، قلوب غمگین، جمہوریت معدوم، شوریت کا نام و نشان تک نہیں، مرکز اسلام کی اور اس طرح بالواسطہ دنیائے اسلام کی اصلاح حال کا یہ آخری سہارا تھا۔ دل پر کیا گزر رہی ہوگی! ایک مرتبہ سخت غش آیا اور فالج کے آثار طاری ہو کر رہے ——— جو فالج پانچ سال بعد جان لیوا ثابت ہوا، وہ اسی وقت کیوں نہ گر پڑا!! اتنی شدید اور دل شکن مایوسیوں کے بعد زندہ بچ رہنا بھی محض کرشمۂ قدرت تھا ——— لوٹ کر آئے تو نہایت درجہ خستہ و مغموم، شکستہ دل و ملول!

سنہ ۲۶ء، محمد علی کی زندگی میں گویا "عام الحزن" سال غم کی حیثیت رکھتا ہے
خصوصاً اس کا پہلا نصف حصہ ——— ان کی ساری پبلک زندگی میں خوشی کا
سال تھا ہی کون سا سال؟ ——— سال شروع ہوتے ہی، حجاز سے، بہ
سلسلۂ اعلان ملکیت، ہمت شکن اطلاعیں آنی شروع ہوئیں مرشد، محبوب مرشد کا
دفعتہً انتقال ہوا۔ فروری میں خود بیمار پڑے، ایسا کہ صاحب فراش ہو کر رہے اور
یہ سلسلہ اپریل تک برابر قائم رہا، یہاں تک کہ انگریزی کا ہفتہ وار کامریڈ اسی بیماری کی
نذر ہو گیا! جنھوں نے کامریڈ کا مسلسل مطالعہ کیا نہیں، جنھوں نے کامریڈ کا زمانہ دیکھا
نہیں، انھیں کیا بتایا جائے کہ کامریڈ کیا چیز تھی، اور انھیں کن الفاظ میں سمجھایا جائے،
کہ اس کے نکلنے کے کیا معنی تھے، اور بند ہو جانے کے کیا معنی ہوئے! اس سے ۱۴-۱۵
برس پہلے ۱۱ء، ۱۲ء میں تو کامریڈ کی زندگی ہندی مسلمانوں کی ساری تعلیم یافتہ جماعت
کی زندگی تھی، ایک روح تھی، جو سارے انگریزی خواں مسلمانوں کو زندہ رکھے ہوئے
تھی۔ علم و ادب، سیاسیات و اصلاح معاشرت، زبان و انشا پردازی، حریت و جمہوریت
شوخی و ظرافت، ہنسی دل لگی، سب کے سبق اس کے صفحات میں درج، ہر سامان اس میں
موجود، اس وقت کامریڈ "مسٹر" محمد علی کا تھا۔ اب محمد علی "مولانا" ہو چکے تھے، ———
آئندہ نسلوں میں اس "مسٹر" اور "مولانا" کے فرق کو سمجھنے والے اور اس تفریق سے لطف
لینے والے ہی کہاں رہ جائیں گے؟ ——— جیل ہو آئے تھے، برسوں کی نظر بندی
اٹھا چکے تھے، کھدر پوش تھے، کلام مجید کے کچے حافظ ہو چکے تھے "صاحب داڑھی" تھے،
اُس وقت ۳۰-۳۵ کے جوان رعنا تھے، اب ۴۵ سے اوپر ادھیڑ سن کے ہو چکے تھے،
جوان چہیتی بیٹی کی موت، بوڑھی نازبردار ماں کی موت ولایت علی (بمبوق) اور غلام حسین
جیسے محبوب ترین و مخلص ترین رفیقوں کی موت، قومی صدمات پر صدمات، پیہم و متواتر مالی
پریشانیاں، وہ اگلا سا ہنسوڑپن اب کہاں سے لا سکتے تھے، پھر بھی کامریڈ ایک زندہ کے قلم کا
اخبار ہوتا تھا، جب تک خود زندہ رہا، خدا معلوم کتنوں کو زندگی بخشتا رہا۔ اب نہ کوئی رفیق
نہ اسسٹنٹ، خود ہی سارا پرچہ مرتب کرتے۔ ناغہ کرنا پرچہ کا اس زمانہ میں بھی معمول تھا، جب

عروج کا زمانہ تھا، اور مددگار موجود تھے، اور اب تو ناغوں کی حد ہی نہ رہی۔ قدردان پھر بھی چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ جیسے ایک دفعہ چسکا پڑگیا، بس اس کا ہفتہ، اور عشرہ، اور مہینہ انتظار ہی کرتے گزرتا۔ آخری نمبر جس پر ۲۲۔ جنوری کی تاریخ پڑی ہے۔ شاید شروع فروری میں نکلا۔ ۱۸ء دسمبر کے بعد کہیں یہ ایک پرچہ جاکر نکلا تھا۔ چار نمبروں کا مجموعہ ۴۸ صفحات کی ضخامت! لیڈنگ آرٹیکل ایک فقہ کی کتاب پر ریویو، پورے ۷ کالموں میں! دوسرا آرٹیکل ہندوستان کی سیاسیات پر ایک فرضی انگریز سویلین کی زبان سے نہایت پُرلطف بھی اور نہایت پُرمغز بھی، ۱۹ کالموں میں! ــــــــ اُس وقت کون جان سکتا تھا، کون یہ علم غیب پڑھے ہوئے تھا، کہ کامریڈ کی زندگی کی یہ بالکل آخری سانس ہے! رہے نام اللہ کا۔ انسان ضعیف البنیان کی کس چیز میں ثبات وبقا ہے؟ آج یہ افسانۂ ماضی ہے، ایک داستان پارینہ ہے، اُس وقت یہ قصہ کہانی نہ تھا، ایک زبردست زندہ قوت تھا ایک! دنیا کو بھول جاتے دیر کیا لگتی ہی ہے ؎

فلک مصروف ہے پیہم نیا نقشہ بچھانے میں
زمیں کو دیر کیا، گزرے ہوؤں کو بھول جانے میں!

مرکزی خلافت کمیٹی کے جلسے بار بار جلد جلد ہوتے رہے، دہلی ہی میں، اور زیادہ تر محمد علی کے ہاں۔ کبھی کبھی حکیم صاحب کے ہاں بھی۔ میں وہی اکتوبر ۲۵ء میں نیا نیا ممبر ہوا تھا۔ کچھ تو تازہ جوش وشوق، اور کچھ محمد علی کی کشش۔ ہر بار ساڑھے تین سو میل کے فاصلہ سے دوڑ دوڑ کر دہلی آتا۔ محمد علی کام سے پسے ہوئے، مخالفوں سے گھرے ہوئے اغلب نہ بجور، جسم محنت سے چور چور، میری حاضری سے باغ باغ ہو جاتے، چھٹی منانے لگتے، ایک دفعہ میں آیا، رات کو پہونچا دوسرے دن، محمد علی نے دن بھر کی چھٹی اپنے دفتر سے لے لی۔ سیر وتفریح کو ترسے ہوئے بیٹھے۔ کسی سے (غالباً ڈاکٹر انصاری سے) موٹر مانگ، برقع پوش بیگم صاحبہ، اور مجھے اور مولانا عرفان کو ساتھ لے، دہلی کے باہر نکل گئے۔ پہلے نظام الدین اور پھر قطب صاحب میں وقت گزارا۔ کچھ ناشتہ ساتھ تھا، کچھ وہاں خرید کر کھایا پیا، مزارات پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں نمازیں

پڑھیں، لوگ ہر جگہ گھیر لیتے تھے، مجاوروں سے اور سب سے خوب گھل مل کر باتیں کیں محمد علی کے ملنے والے اور دور بیٹھے ہوئے شیدائی ہزارہا تھے، لیکن سابقہ کے بعد مخلص اور رازدار دوست رہ جانے والے بہت ہی چند تھے ان چند میں ایک مولانا عرفان بھی تھے، مولانا اُس وقت تک جمعیتہ العلماء دہلی کے عہدہ دار تھے، محمد علی نے خود جمعیتہ اور اس کے بعض عہدہ داروں سے متعلق جس طرح کھُل کر باتیں اُن سے کیں، اُن کی مجھے تو توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی، بیگم صاحبہ کی یہ معیت اور رفاقت کچھ نئی نہ تھی۔ میاں بیوی میں میل محبت شروع ہی سے بہت تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیئے کہ عشق کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ محمد علی کہا کرتے تھے "بغیر تمہیں ساتھ لیے اب مجھ سے کہیں جایا نہیں جاتا۔ جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے، اور نفسانی خواہشیں عنقا ہوتی جاتی ہیں، خالص محبت بیوی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ قرآن میں جو آیا ہے، کہ بیوی سے تمھیں تسکین ملے گی، اُس کے معنی اب سمجھ میں آرہے ہیں،" بیگم صاحبہ رہیں ہمیشہ برقع میں، اور نہایت شرم و لحاظ کے ساتھ۔ چہرہ نقاب سے چھپا ہوا، لیکن ہر جلسہ میں ہر سفر میں۔ ہر مجمع میں، خلافت کانفرنس میں، کانگریس میں اسب کہیں برابر ساتھ رہتیں، اور بہ قدر ضرورت کارروائی میں حصہ بھی لیتی رہتیں —— جو "روشن خیال" قومی کاموں کے لیے، بے پردگی لازمی سمجھتے ہیں، کاش اس نظیر کو سامنے رکھیں۔ بے حیائی اور بے حجابی کی نوبت تو کبھی خدانخواستہ کیوں آنے لگی تھی، بے نقابی اور چہرہ کشائی کے بغیر بھی سارے قومی کام ہوتے رہے!

محمد علیؒ کی مہمانداری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا بڑی بڑی خاطریں ہوتیں۔ ضرورت سے بھی زائد، میری حیثیت سے بھی زائد، اور اُن کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد۔ حق گوئی و حق نگاری میں تو محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی، مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے کھانا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اور پھر کھانا بھی "نان جویں" اور "نمک طعام" نہیں، اچھے سے اچھے سالن، قورمہ، قلیہ، کباب کی متعدد پلیٹیں طرح طرح کے لذیذ و پرتکلف، نمکیں اور میٹھے کھانے، کبھی مرغ، کبھی مچھلی۔ خشک میوے تازے پھل

خود کھاتے، اور دوسروں کو زبردستی کرکے کھلاتے۔ آخر آخر خود تو ذیابیطس سے معذور ہو، مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ مہمانوں کے لیے کوئی پرہیز نہ تھا۔ جاڑوں میں ماش کی کھچڑی بہ افراط گھی کے ساتھ، ضرور دسترخوان پر آتی۔ میں جب جاتا، ہر مرتبہ اصرار کرکر کے وقت سے زیادہ روکنے کی کوشش کرتے، چلتے وقت ہمیشہ ایک معرکہ پیش آتا۔ بخوشی کبھی اجازت نہ دیتے۔ ایک آدھ دفعہ بھاگ کر آنا پڑا۔ عاجز آکر میں نے یہ ارادہ کیا، کہ اب ان کے ہاں ٹھہرا ہی نہ کروں گا۔ اس کے بعد ایک بار دہلی پہونچا۔ اسٹیشن سے سیدھا دہلی خلافت کمیٹی کے دفتر گیا۔ مولوی لقاء اللہ صاحب عثمانی سکرٹری تھے۔ اُن سے کہا کہ "آپ کا مہمان ہوں"۔ بولے "میری مجال ہے جو ٹھہرا سکوں، مولانا محمد علی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ مجبوراً پھر وہیں آنا پڑا۔ بہت خفا ہوئے "مجھ سے بھاگنا چاہتے تھے"! چھوٹوں کے ساتھ اس درجہ شفقت و محبت کی مثالیں بھی کم ہی ملیں گی۔ گاندھی جی کی طرح، محمد علی کا مسلک "عدم تشدد" کا نہ تھا، "تشدد" کے قائل بھی تھے اور عامل تھے۔ متشدد غصہ میں بھی تھے، اور محبت میں بھی۔ اور خدا جانتا ہے کہ اس "متشددانہ عدم تشدد" میں ایک عجب حلاوت ایک عجب دلاویزی ایک عجب محبوبیت تھی!

مزارِ

محمد علی

پر

آنسوؤں

کے

پھول

نمبر	عنوان	صفحہ
۱	سیرت محمد علی کا دیباچہ۔ از مولانا عبدالماجد دریا بادی	۱۴۹
۲	محمد علی۔ از مولانا عبدالماجد دریا بادی	۱۵۷
۳	مولانا محمد علی۔ از مولانا اشرف علی تھانوی	۱۶۴
۴	اسلام کا دیوانہ۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی	۱۶۵
۵	نذر عقیدت (مرثیوں کی صورت میں)	۱۷۰
۶	اقبال۔	۱۷۱
۷	لسان الملک ۔صفی لکھنوی	۱۷۲
۸	جوش۔	۱۷۳
۹	سر پھرا ملاح۔ از فردوسی اسلام حفیظ جالندھری	۱۷۳
۱۰	امیر الشعراء۔ شوقی مصری	۱۸۲
۱۱	شہزادہ محمد علی پاشا	۱۸۳
۱۲	احمد زکی پاشا	۱۸۴

سیرۃ محمد علی رح

پر

مولانا دریابادی کا دیباچہ

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کیے، اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سرفہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر حاضرہ کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جاسکتا ہے، اور وہ نام اُمت کے محبوب ترین ناموں "محمد" اور "علی" کا مجموعہ ہوگا!

اس دَور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کیے، لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی و گرامی مشائخ طریقت پیدا کیے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں ہی کی زبان تک رہا، بعض مشہور رفارمر پیدا کیے لیکن ان کی اور ان کے "رفارم" دونوں کی شہرت، انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور لیڈر پیدا کیے، لیکن انھیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگرسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا، یہ چیدہ مشاہیر اور اکابر کا حال ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر نکلیں اور ان سے بھی تنگ تر

دائروں میں گونج گونج کر رہیں، مُلک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز مشرق نے بھی سُنی اور مغرب نے بھی، شمال نے بھی اور جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی لہروں نے بھی، پڑھے لکھوں نے بھی اور ان پڑھوں نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بڑوں نے بھی چھوٹوں نے بھی، سرداروں نے بھی، اور خاکساروں نے بھی، شہر کے مہذبوں نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی۔ وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی برجیوں نے بھی، اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کال کوٹھڑیوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر و ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی، !

اس کا کلام سُن سُن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کھلا کر ہنسے اس کا پیام سُن سُن کر مسجد کے محراب و منبر بلبلا کر روئے، خانقاہیں اور مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر اور ویرانے، قوم پروروں کی کانگرس اور فرقہ پروروں کی کانفرنس پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ جمیعۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپہ چپہ پر اس کے نقشِ قدم کے نشان، سب کا ذرّہ ذرّہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے پر قبول خداداد اور مرجعیت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت "زورِ بازو" کا نتیجہ نہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اُس کا ہو جاتا ہے، بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا، لیکن آنکھوں کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ جو اللہ کے بندوں ہو گیا تھا اللہ کے بندے اُس کے ہو گئے تھے، محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر، خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لئے وقف کر دیا وعدۂ ربانی کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ع ۶)	یقیناً جو لوگ ایمان اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں خدائے رحمٰن اُن کے لئے (خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دیگا!

کی تفسیریں لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھیں، گوشت و پوست میں مجسّم تفسیر محمدؐ علی کی زندگی میں نظر آئی !

اس دل و دماغ کا، ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے، جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی —— وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے ؟ —— دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رُکنے والی تھی ؟ ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی آئی اور گئی

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح   باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر مسلمان ! انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے ؟ شیرِ خدا علی مرتضیٰؓ کی ؟ خلیفۂ رسول عثمانؓ غنی کی ؟ جوانانِ جنت کے سردار حسینؓ کی ؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اسے کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام، محمدؐ علی کی ناقدری رہی ؟ اور اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجئے ؟ صناعِ کامل کی مصلحتوں کی تھاہ، اور حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے ؟

کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے، ادب و سیاست، خطابت و صحافت، قیادت اور انشا پردازی۔ طرح طرح کے گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بتہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرے کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہو گیا تھا، مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا، مُبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراستِ ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا، اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا[1]،

---

[1] اشارہ ہے مولانا مناظر احسن صاحب (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کی طرف یہ اشعار صاحب موصوف نے مولانا محمد علی کے انتقال پر کہے تھے۔ مؤلف۔

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی | فدائے ملّتِ جانانہ بودی
بہ بزمِ مارئیسِ عشق بازاں | بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی
بدل بودی فقیرِ بے نوائی | بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقابِ چہرہ کردی | وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتی بر حُسنِ پاکت | ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم، نہ سوزم | تو شمعِ دین را پروانہ بودی
بایماں ہاز تو زورے و شورے | بجا نہا ہمتِ مردانہ بودی
رسیدی از رہِ اغیار نایار | عجب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں، لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے، محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں علی گڑھ کے ایک مشہور کھلنڈرے" آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی کے ایک اعلیٰ انشا پرداز، ایک بہترین ایڈیٹر شیکسپیر کے ایک ماہر نقاد، اتھیلو، میبکتھ وغیرہ کے ایک اعلیٰ مبصر، ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ملک کے ایک نامور رہنما، ایک ممتاز ترین سیاسی سردار، لیکن آخر میں؟ آخر میں یہ ساری حیثیات سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت میں جمع ہو گئی تھیں، اور جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لیے مشہور تھا، وہ اپنے خبط و دیوانگی کے لیے بدنام ہو کر رہ گیا، مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا لیکن دل سے صدا اُٹھی تو بس یہی۔ کہ آج "محمد" کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ہاں، وہ محمد کا شیدائی، دینِ مصطفےٰ کا دیوانہ اور اُمتِ محمدی کا بن داموں کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالمِ اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور اُس کی چبھن محمد علی کے ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آئے اور درد سے بیتاب محمد علی، اسلام پر قانونِ اسلام پر، شعائرِ اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آپڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، خود اپنے مسلمانوں سے ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لیے سپر بنا ہوا! ۱۹۲۶ء میں حج اور شرکت اور مؤتمر اسلامیہ

کے لیئے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی ہوئی تھی، تو ہمدرد میں اپنے قلم سے خود لکھا:۔

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام ابن اسلام کی ہو گی۔"

دن رات، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ، آخری سفر پر جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے جو سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، تو اس وقت بھی اسلام کے تحفظ ناموس پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے۔ حق تھا کہ ایسے شخص کی جب موت آئے تو سارا عالم اسلام شرق سے غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا۔ پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لیے، آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے، خود بعض انبیاء کرام تک نے کی ہے، ا سلیمانؑ و داوٗدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ، خود نبی القبلتین کا پہلا قبلہ! (اقبالؒ)

خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت   سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہو گا اُس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اُٹھا کر لائے اُسے سب نے دیکھا، جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اُس کے درجہ اور مرتبہ کو کون پہچانے!

ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ تقریر کر سکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے، سارڈا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انھیں قائل و معقول کر سکتا ہو، کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشاء کے ساتھ بسرعت قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب، لائڈ میں

شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انھیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری طرف مسجد کے منبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی تو ہچکیاں بندھ بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آ جائے، مسئلہ قتل مرتد پر جب استشہاد و استنباط شروع کرے تو اچھے اچھے فقہا اس کا لوہا مان جائیں، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال، امان اللہ خاں، اور سلطان ابن سعود کو آخر تک معاف نہ کرے نماز کا پابند اتنا کہ ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جا نماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت میں شاید بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان ابن سعود کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے، ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرافراز، ایسی ہمہ گیر، ایسی "عامتہ الورود" ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب سیاست، علم، ادب، تعلیم، صحافت، کانفرنسیں اور جلسے، اس پچیس تیس سال کے اندر، اسلامی ہند بلکہ ایک حد تک مملکت ہند، اور عالم اسلامی میں جو بھی تحریک کسی بھی ادارے میں ہوئی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما، اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ سہی اس میں موجود ایسے شخص کی سیرۃ نگاری ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کیئے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیے جائیں کیا کیا پھیلایا جائے، اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی، اور وہ بھی فی الفور نہیں ایک عرصہ تک تلاش و تفحص

جاری رکھنے کے بعد، اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی، لیکن حالات ساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑیئے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے، جمود و افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر، جامعہ ملیہ کا ایک نوعمر و نوخیز ہونہار اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے لیے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا جس کے سنبھالنے کے لئے کئی کئی قوی الجثہ اور تنومند پہلوان، کشتیاں لگائے ہوئے، اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے، آفرین و رحمت اس کی ہمت پر آفرین ورحمت جامعہ کی مستعدی و کارگذاری پر! جامعہ! ہاں وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ

—— وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا

منازل سفر کی دوریوں، اور راہ کی دشواریوں، زاد سفر کی بے سروسامانیوں اور یاراں طریق کی کج ادائیوں کی حکایت کیا، اور کس سے کیجئے؟ اور کیجیے بھی تو والوں سے اُمید کیا رکھیئے خود جوہر ہی کے الفاظ میں،

خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات اپنے نقوش جو کچھ کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں "یہ لخت دل" ہیں، ان پر "مال تجارت" کا دھوکا نہ ہو۔

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحب سیرت کی زندگی سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے اور کبھی کبھی دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گزری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرۃ دیانت کے ساتھ لکھی جائے، اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے، "خالد جانباز" کے وقائع اور کارنامے کوئی "حافظ شیراز کی زبان میں، آخر کیوں کر بیان کرے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو جا بجا صدمہ یقیناً پہونچے گا اس کے لیے

شروع ہی سے تیار رہنا چاہیئے" مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اُٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰ کے سیرۃ نگار کے لیے جنگ صفین، اور حسین بن علی کے سوانح نویس کے لیے میدان کربلا کا ذکر زبانِ قلم پر نہ لانا کیونکر ممکن ہے؟

ازمولٰنا عبدالماجد دریابادی

"شب برات" ایک خیر و برکت والی رات ہے، کسے خبر تھی، کہ یہ شب، شب قیامت یا نمونۂ شب قیامت، بھی بن سکتی ہے، مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں، کون کہہ سکتا کہ ایکی اسی رات کو ان کا نصیبہ سُلا دیا جائے گا؟ زندگیاں مانگتے ہیں، صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں، کسے خیال تھا کہ عین اُسی وقت اسے اٹھا لیا جائے گا، جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔ جس کی زندگی ساری قوم کی زندگی تھی اور جس کی موت، اللہ کا نام جپنے والوں کی موت، محمد کا کلمہ پڑھنے والوں کی موت ہے اس پچھلے زمانے میں مسلمانوں پر کیا کیا نہیں گزری، کیسے کیسے اکابر اٹھا لئے گئے، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر کیا کچھ جھیلنا نہیں پڑا، انگریزوں نے رگیدا، ہندوؤں نے دبایا۔ ترکوں پر "اتحادیوں" کا نرغہ ہوا، شریف نے بغاوت کی، مدینہ کی بستی تباہ ہوئی، مکہ لٹا، خلافت مٹی، افغانستان تہ و بالا ہوا، عراق میں خاک اڑی، مصر کا سردار اُٹھ گیا، شام میں آسمان رویا، فلسطین میں زمین تھرائی، یہ سب کچھ ہوا، اور ہوتا رہا۔ ایک محمد علی کا دم ہر زخم کے لئے مرہم تھا، ہر تازہ صدمہ کے وقت، دل کو ذرا تسکین ہوتی تھی تو اسی خیال سے، کہ جو کچھ بھی چلا جائے، محمد علی تو ہم میں موجود ہے، آہ، کہ شعبان سنہ ۱۳۴۹ ہجری کی شب مبارک کو یہ آخری سہارا بھی چھن گیا، اور جس پاک و بے نیاز نے محمدؐ کے لئے یہ منادی کر دی تھی کہ ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم

اس کے فرشتوں نے اس کے بندوں تک، محمد کے ایک وفادار غلام محمد علی کے لیے بھی یہی صدا پہنچا دی!

اے پاک پروردگار! اے سب کے جلانے اور سب کے اٹھانے والے مولا! تیرا ارادہ بیشک سب کے ارادوں پر حاکم، تیری حکمت و مصلحت قطعاً سب کی حکمتوں اور مصلحتوں پر غالب، تیری مشیت بلا شبہ آن کی آن میں ہر بہار کو خزاں، ہر ہنسی کو رنج، ہر عید کو محرم بنا دینے پر قادر، لیکن کیا ہم جیسے ناتوان و کمزور بندوں کا ظرف اپنی سخت آزمائش، اتنے بڑے ابتلا، اتنے کڑے امتحان کے قابل تھا؟ ایسی آزمائشیں تو ابرار و کاملین کی ہوا کرتی ہیں، ہم کم ظرف اس لائق تھے، کہ جس گھڑی تیری رحمت کے سب سے زیادہ بھوکے ہوں، تیرے فضل و کرم کی بھیک کے لئے تیرے آگے ہاتھ پھیلائے گڑگڑا رہے ہوں عین اسی وقت ہماری سب سے بڑی زندہ دولت، ہماری سب سے زیادہ قیمتی کمائی ہماری سب سے زیادہ عزیز پونجی، ہمارے ہاتھوں سے یوں نکل جائے؟ اور دل چاہتا تھا جس کی موت کی خبر کبھی نہ سننی پڑے، اُسے دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اور اس کے لاشہ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائیں! تیری جناب میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں لایا جاسکتا، لیکن اے کمزوروں اور ناتوانوں کے دلوں کی خبر رکھنے والے مالک، انصاف کر، کہ تیرے حبیب و محبوب کو اس عالم ناسوت سے کوچ کرتے دیکھ کر جب فاروق اعظمؓ کا قلب تاب نہ لا سکا تو تیرے اس حبیب پاک کے ایک ہمنام غلام کے غم مفارقت میں اگر ہم کم ظرفوں کی زبانیں لڑکھڑانے لگیں، تو ہماری فطرت سے کچھ بعید ہے! ہم نادان و نابینا تو ادنیٰ سی ادنیٰ آزمائش کا بھی تحمل نہیں کر سکتے، وقت کی اس سب سے بڑی اور سب سے کڑی آزمائش کے لئے دل و جگر کس سے مانگ کر لائیں!

جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیے لکھے جا رہے ہیں، تجویزیں پاس ہو رہی ہیں، کہ ایک بڑا قومی لیڈر اُٹھ گیا، نیشنل کانگریس کا سابق صدر چل بسا، ہندو

مسلم اتحاد کا علمبردار رخصت ہو گیا، یہ سب کچھ صحیح ہو گا، لیکن یہ کسی کی زبان پر نہیں آتا، کہ اللہ کا بندہ اُٹھ گیا، اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمد کے نام کا عاشق زار رخصت ہو گیا! آج ماتم اس کا نہیں، کہ ایک جادو بیان مقرر، اور بہترین انشا پرداز گم ہو گیا، ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا، جو سچائی کا پتلا تھا، جو حق گوئی کا مجسمہ تھا، جس نے اپنی دنیا برباد کر کے، اپنی عاقبت بنائی تھی، جس نے اپنی مرضی کو اپنے مولا کی رضا میں فنا کر دیا تھا، جس نے زرّین لباس چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی تھی، جس نے بیش قیمت سوٹ اتار کر جیل کی کملی اوڑھ لی تھی۔ جس کے دل میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، اگر دھن تھی تو اللہ کے دین کی، اور ہر لمحہ و ہر آن اگر تڑپ تھی، تو رسول کی نصرت و خدمت کی! اس کی سچی آپ بیتی تو خود اسی کے ایک شعر میں سنیے ؎

سب کھو کے تری راہ میں اِس دولت دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے!

بیشک اس نے دنیا، اور دولت دنیا، ساری کی ساری کھو کے رکھ دی، اور کھوئی بھی کسی کی راہ ہی میں! "کھوتے" ہوئے اور "لٹتے" ہوئے سب نے دیکھا، "پاتے ہوئے اور "لیتے" ہوئے کی جھلک کسی کسی نے "آج" بھی دیکھ لی، اور "کل" انشاءاللہ سب ہی دیکھیں گے۔

ذہانت، ناموری، شروع ہی سے حصہ میں آئی، علیگڈھ میں نام پیدا کیا، اکسفورڈ جا کر ناموری کہاں سے کہاں پہنچی۔ "سول سروس" کی جانب لپکے الٹے پاؤں واپس کئے گئے، بڑودہ اور رامپور دونوں کی قدر شناسیوں کا چند روز مزہ چکھا۔ بیوہ اور تہجد گزار ماں کی دعا نے جو غلاف کعبہ کو پکڑ کر رب کعبہ سے مانگی گئی تھی، کہ میرے شوکت اور محمد کو اسلام کا خادم بنا دے" ساتھ نہ چھوڑا۔ جو نہ صرف "مسٹر" تھا، بلکہ مسٹروں کا سردار تھا، دیکھتے ہی دیکھتے "مولانا" تھا، چہرہ پر ڈاڑھی، سر پر پٹے، جسم پر کھدر، حافظہ میں قرآن اور دل کے اندر اسلام کا سوز، اور دین کی تڑپ! ایک سوزش تھی کہ ہر وقت پھونک رہی تھی، ایک جوشش تھی کہ ہر آن خون کو کھولا رہی تھی! لڑکی ایک نہیں، دو

لڑکیاں، چھوٹی بچیاں نہیں، پامالی پوسی، شادی شدہ جوان لڑکیاں، عاشق زار باپ کے آغوش میں تڑپ تڑپ کر اور سسک سسک کر مریں! قومی زندگی میں ہر طرف سے مخالفت، ہر منصوبہ ناکام، ہر سمت سے الزامات، قابلیت کا اعتراف سب کو، خلوص کا اقرار دشمنوں تک کو، لیکن ناکامی ہر طرف سے مسلط، کمریڈ و ہمدرد کے بلند ترین معیار کا قائل ہر ایک متنفس۔ لیکن دونوں پرچے ناقدری کی نذر! نظربندی کی سختیاں جھیلیں، جیل خانہ کی کڑیاں اٹھائیں، اور آخر عمر میں اس سے بڑھ کر آزمائش، کہ عمر بھر کے رفیقوں اور عزیزوں سے بے تعلقی، آویزش، جنگ! مسلم لیگ سے جنگ، فرنگی محل سے جنگ، جمیعتہ العلماء سے جنگ، "پنجابی ٹولی" سے جنگ، "بنگالی ٹولہ" سے جنگ، احناف سے جنگ، اہلحدیث سے جنگ، ہندوؤں اور انگریزوں سے جنگ، مدت سے تھی ہی، اب اپنے مخلصوں، عزیزوں اور بھائیوں سے بھی جنگ! تصدق شیروانی، خواجہ مجید، ڈاکٹر محمود، اور انتہا یہ ہے کہ انصاری تک سے جنگ! غرض ایک خدا کے لئے، ساری خدائی سے جنگ، ! دیکھنے والوں کو دیکھ دیکھ کر ترس آجاتا تھا، لیکن جس کی نگاہ جہاں تک پہنچ چکی تھی کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے!

اُسے کوئی کیا سمجھاتا، اور کیونکر روکتا! اللہ کا شیر، اللہ کے لئے، سب سے لڑا، اور خوب لڑا، شاعری کے عالم میں زبان سے جو کچھ نکلا تھا، واقعات کی دنیا میں اس نے اُسے سچ کر دکھایا۔ کہا کرتا تھا، اور بالکل سچ کہا کرتا تھا، کہ آج اگر ساری دنیا مجھ سے روٹھی ہوئی ہے تو میں بھی ساری دنیا سے روٹھا ہوا ہوں

احباب بار بار بگڑ بگڑ کر کہتے تھے، کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے، خبطی ہو گیا ہے، کہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بناتا چلا جا رہا ہے، نہ مصلحت وقت پر نظر ہے، نہ کسی کی دلشکنی کی پروا، نہ اپنا نفع نقصان دیکھتا ہے، کوئی کہتا، کہ آخر ساری دنیا کے اخبارات

چل رہے ہیں، کمریڈ و ہمدرد کو بھی آخر کاروباری اصول پر کیوں نہیں نکالا جاتا؟
کوئی صاحب فرماتے کہ کونسل اور اسمبلی میں جانے کے بجائے فضول شور وغل میں
پڑ کر محمد علی نے اپنی قوت و وقت کو ضائع کیا۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہوتا، کہ
جامعہ ملیہ کی پرنسپلی پر جم جاتا تھا، یا تاریخ پر ریسرچ کے بعد کوئی محققانہ تصنیف
کرنی تھی، اعتراضات صحیح تھے، محمد علی واقعی دیوانہ ہو چکا تھا۔ اُسے جو کچھ دکھایا
گیا تھا، اس کے بعد بھی اگر دیوانہ نہ ہو جاتا، تو اس کی دیوانگی میں کیا شبہ تھا؟

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد
مرعسس را دید و در خانہ نہ شد

کیسا وطن اور کہاں کی وطن پرستی؟ آج ہر طرف سے زور لگ رہا ہے، کہ محمد علی
کی نیشلسٹ ثابت کر دکھایا جائے، وہ "دیوانہ" عقل و فرزانگی سے بیگانہ، دیوانگی
کے اس مرتبہ تک پہنچ چکا تھا، جہاں نہ "نیشنلزم" باقی رہ جاتی ہے، نہ "کمیونزم"
وہاں مدنظر صرف خالق کی رضا تھی۔ کیا خدا کی شان ہے، کہ جو اتنا اونچا ہو چکا،
اُسے نیشنلزم کی پستی پر زبردستی گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے، اور جو مخلوق کو
چھوڑ کر خالق کی پرستاری میں لگ چکا تھا، اس کے لئے باعث فخر یہ بتایا جا رہا
ہے، کہ وہ "وطن" اور "ہندوستان" کے بُت کا پجاری تھا! بیشک محمد علی
بہت بڑا ہندوستانی تھا، اسے اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا، لیکن اس کی
ہندوستانیت ماتحت تھی اس کی اسلامیت کے! وہ "خدا" اور "وطن" دو کا قائل
نہ تھا، قائل صرف "خدا" کا تھا، اور چونکہ خدا ہی نے وطن والوں کی خدمت
بھی فرض رکھی ہے، اس لئے وہ وطن کا خادم بھی تھا۔

تمنائیں اور آرزوئیں بڑے بڑوں سے کی گئی ہیں۔ اور جب وہ امیدیں ان پاکوں
سے پوری نہیں ہوئی ہیں، تو ناپاکوں نے ان پر حملے بھی خوب خوب کئے ہیں۔ آج کی
کوئی نئی بات نہیں، یہ سنت قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ قالوا یا صالح قد کنت

فینا مرجوا قبل ھذا اتنہانا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا واننا لفی شلٍّ مما تدعونا الیہ مریب۔ اور یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے، کہ جس نے ذرا سا بھی دعویٰ محبت کا کیا، اسکا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا، کسی کو آرے سے چروا دیا گیا، کسی کو دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی، کسی کے خاک اور خون میں لوٹنے اور تڑپنے کا تماشا دیکھا گیا، کسی کو جلاوطنی نصیب ہوئی، کسی کا جسم کوڑوں سے لہولہان کرایا گیا، اور کسی کو قیدخانہ کی بوجھل زنجیروں سے گراں بار کیا گیا۔ محمد علی کے لئے کیا یہ قانون بدل دیا جاتا؟ اور جس نے یہ کہا تھا کہ

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا؟ محبوبوں کے ساتھ معاملہ جو کچھ بھی ہوتا ہو، محبوں اور عاشقوں، سوختہ جانوں اور دلفگاروں کے لئے تو یہی ایک قاعدہ مقرر ہے، ذلت و رسوائی، قید و بند، قتل و خون، ناکامی و نامرادی، شکست و شکست نفس!

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر | عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
عشق معشوقاں دو رخ افروختہ | عشق عاشق جان او را سوختہ

محمد علی، تو جا، اور خوش خوش جنت میں اپنی جگہ لے! تجھے آج کون مردہ کہتا ہے؟ غریب الوطنی کی موت بجائے خود ایک درجۂ شہادت رکھتی ہے۔ پھر تیرے شہید و صدیق ہونے پر تو اللہ کا کلام شاہد ہے۔ والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اُولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم۔ تو اس وقت اپنے ماتم کرنے والوں سے کہیں زیادہ مسرت و آزادی کے ساتھ اپنا وہی روشن چہرہ لئے ہوئے عالم برزخ میں جنت کی سیر کر رہا ہے، اور ... نیازمندوں کو اپنی جگہ یہ یقین ہے، کہ بغیر اپنے دوستوں اور

مخلصوں کے جمِ غفیر کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے تو ہرگز جنت کے اندر قدم رکھنا پسند نہ کرے گا اپنی ناسوتی زندگی میں تو نے اپنے چھوٹوں کو اپنے سے آگے رکھا جنت کی لطیف فضا میں تیرا یہ جوہر کہیں زیادہ روشن ہو کر چمکے گا، اور جس طرح دنیا میں تو نے لاکھوں کروڑوں کی رہنمائی کی، جنت میں بھی انشاء اللہ بہتوں کی رہبری اور رہنمائی کا علم تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ مدت ہوئی تو نے اپنے ایک رفیق خاص، غلام حسین مرحوم (سب ایڈیٹر کمریڈ و ایڈیٹر نیو ایرا) کے ماتم میں چند شعر کہے تھے، وہی شعر آج خود تجھے سنانے کو جی چاہتا ہے:

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے!
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے۔
تم کو ایسا ہی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دئیے ہوتے
تھی شہادت کی کسقدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ — ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

بدنصیب قوم تو رو، اور ساری عمر روتی رہ، آج تو بیوہ ہو گئی، تیرا والی و وارث چل بسا، تیرا سہاگ لٹ گیا، صبر کر، جس طرح غمزدہ رانڈیں اور سوگوار بیوائیں صبر کیا کرتی ہیں! خفتہ بخت ملت آج تو یتیم ہو گئی، تیرے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، شفقت پدری سے تو محروم ہو گئی۔ صبر کر جس طرح بے کس اور بے بس یتیم صبر کرتے رہتے ہیں! اللہ میں سب قدرت ہے، وہ ہر نیست کو ہست، ہر ناممکن کو ممکن کر دکھا سکتا ہے، لیکن ہم گرفتار اسباب بندے اب کیا کہکر اپنے دل کو سمجھائیں، اور کس چیز سے اپنے کو تسکین دیں؟

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح — باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

محمد علی کی عمر کل ۵۲ سال کی ہوئی، حضور انور نے اسی عمر میں مکہ سے ہجرت فرمائی تھی۔ آقا کی مکی زندگی کا عکس وفادار غلام کی زندگی کے آئینہ میں خاصہ نظر آ رہا، قبل اس کے مخدوم کی مدنی زندگی کی فاتحانہ شان جھلکنے پائے خادم کا رشتۂ حیات ہی منقطع کر دیا گیا! آج کی حسرتیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کس کس طرح کل کی نذر رہیں گی۔

مولانا محمد علی

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر میں۔

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں مجکو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی محبت بیغرض ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔

اسلام کا دیوانہ

"ہائے اسلام کا وہ دیوانہ روانہ ہو گیا"

مولانا محمد علی مرحوم جن کو اب میں حضرت مولنا شاہ حاجی حافظ محمد علی شہید نور اللہ ضریحہٗ و اشرق نور وجہہ روحہٗ کہتا ہوں، کے متعلق لوگوں کا کچھ ہی خیال ہو، لیکن ان کے ایک نادیدہ مخلص کے سامنے ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچے کا ایک مجذوب فقیر تھا، کل ساڑھے چار بجے حیدر آباد کے مسلمانوں کا ایک عظیم جلسہ رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے جمع ہوا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوا تھا، جلسہ سے کچھ دیر پیشتر دماغ میں چند مصرعے موجزن ہو گئے، قلمبند کر لیا چونکہ تعزیتی تجویز کے پیش کرنے کی سعادت میرے سپرد ہوئی تھی، اس لئے کھڑا ہوا اور نہیں بول سکتا تھا! لیکن بولنے پر مجبور رہا۔ حمد و نعت کے بعد۔ ما محمدٌ الا رسول، قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم و من ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً و سیجزی اللہ الشاکرین۔ وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا و من یرد ثواب الدنیا نوته منها و من یرد ثواب الاخرة نوته منها وسنجزی الشاکرین۔ پھر حدیث الاعمال بالنیات ولکل امر ما نوی الحدیث۔ پڑھی اور کہنے لگا، کہ اپنی بے زوری میں زور پہنچانے

کے لئے ہیں نے اسی تاریخی ثابت کی پناہ ڈھونڈھی ہے، جس کے نیچے دنیا کے سب سے بڑے انسان سے جدا ہو جانے کے بعد دنیا کی سب سے بہترین جماعت کو تسلی ملی تھی۔ دیکھو رامپور کی ایک بیوہ جو ایمان و اسلام کے گھرانے کا روشن چراغ تھی، اور عزم و یقین کا پہاڑ، اس سے کہا گیا کہ اپنے بچوں کو اس اسلامی مدرسہ میں بھیجدے، جس کا نام مدرستہ العلوم مسلمانان تھا۔ نیک نیت ضعیفہ نے اسلام ہی کے لئے غالباً اس نیت سے اُس نے اپنے بچوں کو وہاں داخل کیا، لیکن معاملہ دوسرا ہوا، اس نے اسلام کے آغوش میں پرورش پانے کے لئے لڑکوں کو اس مدرسہ میں بھیجا تھا، لیکن ان کو ایسی گود میں ڈال دیا گیا جس کی ہر سکن اسلامی تحریک کے لئے خطرناک ضرب تھی۔ لڑکے بیوہ کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس نے ان کو دین سے نزدیک ہونے کے لئے بھیجا تھا لیکن وہ دُور ہوئے ہوتے گئے، اور اتنے دور کہ بالآخر ان میں جو چوتھا تھا، اس کے لئے یہ بعد بھی کافی نہ ہوا اور وہ اکسفورڈ کے ان بلند میناروں پر چڑھ گیا، جہاں سے اس کی ماں کا روشن ایمان نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بڑی کامیابیاں، بڑی اولوالعزمیاں تھیں، جو اس غیر اسلامی فضائیں اس کے ارد گرد جمع ہوئیں کہا جاتا ہے، کہ اپنے عہد کا وہ تیسر ہونہار طالب العلم شمار کیا گیا۔ کرزن، رانلڈ شے، کے بعد اس کی تصویر سے آکسفورڈ کے معلموں نے اپنے نمائشی کمرہ کو سجایا۔ وہ ہندوستان واپس ہوا یہ جذبہ لے کر، کہ روپیے کے کسی ڈھیر میں اپنا حصہ مقرر کرے، اور عمدہ موٹریں، دلکش بنگلے، قسم قسم کے کھانے طرح طرح کے لباس، سے لذت اندوز ہوتے ہوئے، ہم چشموں میں اپنے کو نمایاں کرے۔ چند دنوں کے لئے وہ اس وادی میں چلا، لیکن بڈھی ماں کی پاک نیت غیب میں جا کر جاذبہ الٰہیہ کی صورت میں مبدل ہوئی، مسٹر محمد علی (آکسن) پر پالٹیکس کا جنون سوار ہوا، بڑودہ سے روانہ ہو کر دیکھا گیا، کہ چڑھی ہوئی موچھوں، زرق برق سوٹوں کے درمیان ایک عالیشان کوٹھی کے اندر، ٹائپ رائٹر لئے ہوئے، اس مسلمان بڈھی بیوہ کا لڑکا ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے

گوشہ تک اپنے ادبی زور، انشائی قوت، سیاسی مہارت کا غلغلہ بلند کر رہا ہے۔ نہ صرف ہندی انگریزی خواں، بلکہ خالص اینگلوسیکسن نسل کے افراد، جن میں اس عہد کا وہ شخص بھی شریک تھا، جو برِ اعظم ہند کا گورنر جنرل اور برٹش امپائر کے تاجدار کا نائب السلطنت سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے، کہ لارڈ ہارڈنگ کی بیوی ہفتہ کئے اسدن کو نہایت اضطراب میں گذارتی تھی جبدن کامریڈ کے پہنچنے کی امید ہوتی تھی سیاست پہلی کمند تھی، جو پھینکی گئی، تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک بھاگے ہوئے غلام کو اس کے آقا کے آستانے تک پہنچا دیا جائے۔ دوسری جنبش دنیا کے اس حادثۂ عظمیٰ سے شروع ہوئی، جس نے مختلف دوروں سے گزرتے ہوئے، بالآخر "مسئلۂ خلافت" کے مستقل عنوان سے شہرت حاصل کی "خلافت کا دامن اگر ایک طرف عالمگیر سیاستِ عالم' سے بندھا ہوا تھا؛ لیکن بہر حال اس کا دوسرا کنارہ اس سراپردۂ نبوت سے وابستہ تھا، جس کے گوشے قبۂ خضرا کے کنارے لٹک رہے تھے۔ سچ یہ ہے کہ محمد علی نے خلافت کو سیاست سمجھ کر پکڑا لیکن خلافت نے مسٹر محمد علی (آکسن) کو اس "دونیت" کے ساتھ پکڑا جو اس کی ضعیفہ ماں کی آخری آرزو تھی۔ کچھ دن نہیں گذرے کہ آکسفورڈ کا مشہور معروف علیگڈھ کالج کا فخر و ناز، گھسیٹا جارہا تھا، کھینچا جارہا تھا، اور ان جھٹکوں کے ساتھ گھسیٹا جارہا تھا، کہ دیکھنے والوں کو رحم آنے لگا، وہ کھنچا، کھنچا، اتنا کھنچا، کہ بالآخر اس کی نگاہوں سے وہ سارا تماشا نابود ہو گیا، جو اب تک اس کے سامنے تھا۔ اب اس کے آگے کچھ نہ تھا، اور اگر کچھ تھا، تو وہ صرف جمال جہاں آرا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہ اس میں غرق ہوا، ڈوبا، اور ایسا ڈوبا، کہ پھر کبھی نہ ابھرا عشق کی وادی میں سیاست کے میدان سے آیا تھا، نادانوں نے آخر وقت تک اس کو لیڈر، قائد، انگریزی زبان کا منشی، اردو کا خطیب و شاعر سمجھا، حالانکہ محمد علی تو جانباز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور یوں اِنما الاعمال بالنیات" کی تفسیر پھر ایک بار ایسی ہستی کے ذریعہ سے

کرائی گئی۔ جس کی عظمت وجلال کا سکہ ایشیا پر بھی جما ہوا تھا، اور جس کے رعب قابلیت کی دھاک یورپ کے قلوب پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کا ذکر افریقہ کے صحرا میں بھی عزت کے ساتھ کیا جاتا تھا، اور جسے وہ بھی جانتے تھے، جو نئی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ حدیث بخاری کے پہلے صفحہ میں پڑھو اور اس کی شرح ایشیاء کی وسعتوں، یورپ کی کشادگیوں، امریکہ کی پہنائیوں، افریقہ کے طول وعرض پر مطالعہ کرو۔

محمد علی کیسی غلطی تھی، ان لوگوں کی جو تجھے آخر میں بھی وہی سمجھتے تھے جو تو اول میں تھا، اور اس سے صبر وقرار کی توقع کرتے تھے، حالانکہ وہ صرف روتا تھا، اور اس سے حزم واحتیاط کی امیدیں باندھتے تھے، حالانکہ اس سے اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ اس سے مصلحت دوزی وعاقبت اندیشی کا انتظار کرتے تھے، حالانکہ وہ مصلحت سوز تھا۔ ہاں! کبھی وہ مسٹر محمد علی (آکسن) تھے، لیکن کیا اب وہ علوی شجاعت کے اندر غرق ہو کر صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فانی ہونے والا انسان نہ تھا، یقیناً اس نے کبھی شکسپیر اور ملٹن کے اشعار یاد کئے تھے، لیکن اب اس کی زبان پر قرآن مجید کی ربانی آیتوں کے سوا اور بھی کچھ تھا۔ کیا عجیب انجام ہوا اس شخص کا جو شیطانی راہوں پر سلوک کرنے کے لئے نیت کی نہیں، بلکہ تجویز کی غلطی سے پڑ گیا تھا، لیکن جذب کی قوت نے راہ کفر کے اس سالک کو اسلام کے میدان کا مجذوب بنا دیا۔ وہ آکسن اور مسٹر بن کر جوان ہوا تھا، لیکن حاجی، حافظ، مولنا بن کر شہید ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفی ذالک فلیتنا فس المتنافسون۔

مولنا عبدالماجد صاحب! میں نے کن شکلوں سے ان فقروں کو ادا کیا، اور کس طرح اس وقت لکھ رہا ہوں، بس کیا عرض کروں۔ میں نے مولنا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں دیکھا تھا، لیکن میری روح ان کو کیوں دیکھ رہی ہے۔ خدا جانے کیا مناسبت تھی۔ آپ کا بار بار یہ جملہ یاد آتا ہے تجھ سے اور ان سے بڑی مناسبت ہے۔ بہر حال میں نے خدا جانے اور کیا کہا،

کیا بکا۔ اس کے بعد وہی چند مصرعے جو موزوں ہوئے تھے شکستہ گستہ حال میں چیخ چیخ کر سنانے لگا۔ آپ کی خدمت میں بھی بھیجدیتا ہوں، جو کچھ میں ان کو پا رہا ہوں ان مصرعوں میں شاہ مُدان کی تصویر کسی نہ کسی طرح اُتر گئی ہے

بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی	فدائے ملت جانانہ بودی
بہ بزم ماریں عشقبازاں	بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی
بہ دل بودی فقیرے بینوائے	بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی	وگرنہ عاشق مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشق پاکت	ز آئینِ خرد بیگانہ بودی
چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم	تو شمع دین را پروانہ بودی
باینما نہاز تو زورے و شورے	بجا نہا ہمت مردانہ بودی
رسیدی اندہ اغیار تا یار	عجب مستی عجب دیوانہ بودی

چہ آمد بر سر رنداں کہ آں را
خم و خمخانہؑ و پیمانہ بودی

نذرِ عقیدت[۱]

مرثیوں کی صورت میں!

محمد علی کی وفات ایک ایسا سانحۂ کبریٰ تھا کہ ہر طبقہ اور ہر جماعت نے ان کے غم و الم میں نمایاں حصہ لیا، چنانچہ ان کی وفات پر جہاں تقریریں ہوئیں، جلسے ہوئے، تجویزیں پاس ہوئیں، مضامین و مقالات لکھے گئے، اکابرین ملک نے بیانات کی صورت میں اپنے غم و الم کا اظہار کیا، وہاں شعرا نے اپنے جذبات کو اشعار کی صورت میں مدون کیا، اور محمد علی کے حضور میں اپنا یہ خراجِ عقیدت، بصد رنج و تعب پیش کرنے کا افتخار حاصل کیا۔

ان محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ سارے مرثیئے آپ کی خدمت میں پیش کئے جاسکیں، مجبوراً چند پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور ان میں بھی اخذ و التقاط سے کام لینا پڑتا ہے، سیرۃ کے آئندہ مطول ایڈیشن میں کوشش کی جائے گی کہ تمام قابلِ ذکر مرثیئے، بتمامہ شائع کئے جاسکیں۔

اس سلسلہ کا آغاز مشرق کے زبردست شاعر علامہ اقبال کے ان چند اشعار سے کیا جاتا ہے جو گو تعداد میں کم ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان چند اشعار کے اندر محمد علی کی سیرۃ اور خصوصیت کا پورا مرقع علامہ ممدوح نے پیش کر دیا ہے۔

---

[۱] یہ مرثیوں کا حصہ سیرۃ محمد علی مرتبہ جناب رئیس احمد جعفری سے نقل کیا گیا ہے۔ اقبال سلیم

اقبال

یک نفس جان نزار او تپید اندر فرنگ
تا مژه برہم زنیم از ماه و پرویں در گزشت

اے خوشا مشتِ غبار او کہ از جذبِ حرم
از کنار اندلس و از ساحل بربر گزشت

خاک قدس او را بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

می نہ گنجد جز بہ آں خاکے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گزشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گزشت

مرگ غربت

(از مولنا صفی لکھنوی)

کیوں اشکبار ہند نہ ہو صورت سحاب
مغرب میں جب غروب ہو مشرق کا آفتاب

وہ مرد ذی کمال کہ جس نکتہ سنج کی
تحریر بے نظیر تھی تقریر لاجواب

اسلامیوں کے واسطے سینہ سپر وہ شیر
تیغِ زبان سے معرکہ آرا و فتحیاب

آزادیِ وطن کی تمنّا کا خضر راہ
وابستہ جس کے شیب سے تھا قوم کا شباب

مسلّم ہوں یا ہنود ہوں وہ چاہتا یہ تھا
اپنے وطن کے دونوں نہیں مالک الرقاب

وہ پختہ مغز قائدِ اعظم، بلند فکر
ہر دم رہا جس کے پیش نظر جادۂ صواب

وہ حق پسند جس کی زبان پر چڑھی ہوئی
اللہ کے رسول پر اتری ہوئی کتاب

آزادیِ وطن کے لئے دیکے نقد جاں
پلٹا ہے وہ مسافرِ اخلاص انتساب

ہر صوبہ دے رہا ہے جسے دعوت قیام
آنکھیں بچھا رہی ہے لحد بہر فرش خواب

جس بے نوا کی قبر پہ چھڑکاؤ کے لئے
آمادہ طفل اشک بھرے شیشۂ گلاب

بے ساختہ زباں پہ یہ جاری ہوا صفیؔ
وحشت اثر خبر سے بڑھا جبکہ اضطراب

ہنگام نزع قوم ہی کا دل میں درد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے بھی محمد علی پر چند اشعار کہے ہیں اور حق یہ ہے کہ جوش نے اپنے اشعار میں سوز و گداز اور حقیقت و بیانِ واقعہ کا جتنا مکمل امتزاج کیا ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

اے متاعِ بردۂ ہندوستان و ایشیا — اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
غش تھا کاوش پہ تری اندازۂ صبح و مسا — ختم تھی قدموں پہ ترے تیرگیٔ لیل و نہار
اے غرورِ ملک و ملت تو وہاں لیتا تھا سانس — موت جس عالم میں بنتی ہے حیاتِ پائدار
وقت کے سیلاب سے تیرا سفینہ ہے بلند — سیرتِ پیغمبرِ اسلام کے آئینہ دار
تجھکو بخشی تھی مشیت نے وہ برتر زندگی — جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ — اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند و استوار
طنطنے سے تیری ہیبت آفریں آواز کے — تھی حسین ابنِ علی کی استقامت آشکار
ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی — تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغِ آبدار
موڑ کر رکھ دی تھی تو نے جنگ کے میدان میں — اہلِ بدعت کی کلائی خنجرِ باطل کی دھار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسرِ اورنگ کو — اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن سلطان شکار
خون میں تیرے نہاں تھی جنبشِ نبضِ علی — خون میں تیرے ودیعت تھا مزاجِ ذوالفقار
تیری سیرت میں تھی مضمر صولتِ پیغمبری — تیری فطرت میں تھی پنہاں سطوتِ پروردگار

روئے ملت پر ہے تیری موت کی تابندگی
کج ہوئی جاتی ہے ماتھے پر کلاہِ افتخار

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاّح

فردوسی، اسلام حفیظ جالندھری

(مجاہد ملت مولانا محمد علی قدس سرہٗ کی وفات پر)

شبِ تاریک بیم موج گردابِ چنیں حائل "

نہنگانِ اجل کی نیستیں بے داد پر مائل

غضب تھا اِک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا

وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اک "سرپھرا" ملّاح طوفانوں سے لڑتا تھا

ہَوا کے آب کے جنوّن سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انسان تھے

یہ سب ملّاح کے ہم قوم تھے یعنی مُسلمان تھے

یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر

مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر

چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی

اُبھرتی، بیٹھتی، دبتی دباتی اور چکراتی

کہیں گرداب کے مُنہ میں کہیں پُرشور دھارے پر

کبھی اِس کے اشارے پر کبھی اُس کے اشارے پر

ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں

پہاڑ اٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں

فلک پر بے تحاشا دوڑتے تھے ابر کے گھوڑے

کڑکتی بجلیاں برسا رہی تھیں آتشیں کوڑے

اڑا کرتے ہیں صدموں سے جگر کے جس طرح لختے

اُکھڑتے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ناؤ کے تختے

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی "باکمالوں" کو

انھیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

انھیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
انھیں گُر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے

یہ طوفانوں پہ کو سکتے تھے پچھے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں

ہوا کا رُخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
تہِ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے

یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں لیٹے تھے
پُرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ "سر پھرا ملاح" تنہا تھا اکیلا تھا

اِدھر موجوں کی شدت تھی، اُدھر پانی کا ریلا تھا

وہ چلاتا تھا۔ اٹھو بھائیو۔ آؤ۔ ادھر آؤ

ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ہوا میں اڑ چکی ہے دھجی دھجی بادبانوں کی

شکستہ ہو چکی ہے ناؤ۔ مانگو خیر جانوں کی

اُکھڑ جائیں گے تختے۔ آؤ ان کو تھام لو آکر

سلامت ہیں جو کچھ "اوزار" ان سے کام لو آکر

اِدھر سیلاب بھرآتا ہوا معلوم ہوتا ہے

ادھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ

حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

مبادا ناؤ اب کے اور بھی کمزور ہو جائے

یہ گردابِ بلا شاید دہانِ گور ہو جائے

وہ چلایا وہ چیخا منتیں کیں آہ و زاری کی

مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی

نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر

سبھی ہنستے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر

بُلاتا تھا وہ نامِ غیرت اسلام لے لے کر

جھڑک دیتے تھے لیکن سب اسے دشنام دے دے کر

مگر ملّاح اپنے فرض کا احساس رکھتا تھا

وہ اپنے ساتھیوں کی آبرو کا پاس رکھتا تھا

اُسی نے جسم پر کھائے تھپیڑے تند موجوں کے

اُسی کے ساتھ ٹکرائے ہوائے تیز کے جھونکے

وہ اپنی جاں پر سہتا رہا۔ سہتا رہا تنہا

اُٹھو! ہمت کرو!! کہتا رہا کہتا رہا تنہا

مگر ہنستے رہے ہنستے رہے غفلت کے شیدائی

اسی کشتی کے ہمراہی اسی ملّاح کے بھائی

اُدھر بڑھتی رہی۔ بڑھتی رہی دریا کی طغیانی

ادھر گھٹتی رہی۔ گھٹتی رہی توفیقِ اِنسانی

شکستہ ناؤ کا ملّاح بے دم ہو گیا آخر

بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر

گرا دریا میں چپّو۔ ہاتھ سے پتوار بھی چھُوٹی

شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی

وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈھتا تھا اب بھی یاروں میں

اُنھیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں

مگر اُس کے اشاروں کو سمجھ سکتا نہ تھا کوئی
سمجھ سکتا بھی ہو۔ تو اس طرف تکتا نہ تھا کوئی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ

لگا جُھکنے وہ سر افراز سر آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طُوفانوں سے جھکتا تھا

نہ فرعونوں سے جُھکتا تھا نہ ہامانوں سے جُھکتا تھا

نہ جُھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے

وہ سر۔ اک مرتبہ پھر جُھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا

کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اُس مردِ مُسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طُوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پُورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

نہ رو او بے حمیّت قوم! اب رونے سے کیا حاصل!!

دکھانے کے نہیں قابل یہ منہ دھونے سے کیا حاصل!!

ترا رونا تری طرزِ ستم سے بھی نرالا ہے

اُسے روتی ہے۔ جس کو تو نے خود ہی مار ڈالا ہے۔

درِ توبہ بغیر از توبہ ہرگز کھل نہیں سکتا

لہو کا داغ رسمی آنسوؤں سے دھل نہیں سکتا
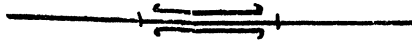
امیر الشعراء شوقی مصری

"اخبار الشوریٰ" مصر میں احمد شوقی کا یہ بلند پایہ مرثیہ شائع ہوا تھا، جس کے بستہ جستہ اشعار کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے، پورا مرثیہ طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اے قدس! تو اپنی تربت کے مہماں کی وجہ سے قابل مبارک باد ہے، آج
تو اس کی ملاقات سے سرفراز ہو۔

نبیؐ نے اس کے لیئے اپنے براق کے بیٹھنے کی جگہ کھول دی اور اس کے
آنے کا مقام وہ ہے جہاں سے نبیؐ رات کو گئے تھے۔

مشرق کے حقوق کے لئے لڑنا اس کا کام تھا اور اسلام کا قضیہ اس کی عبادت
مشرق کے لئے جو اسے تڑپ تھی یا ہندوستان کے واقعات کے لئے
اس کی بے خوابی اسے عزیز ہندوستان فراموش نہیں کرسکتا۔

نیل اپنی مصیبتوں میں اس کی آواز کو یاد کرے گا، اور ترک اس کی سچی
تڑپ کو فراموش نہیں کریں گے۔

آپ نے زندگی میں وہاں کے باشندوں کی مدد و معاونت کی تو آپ
وہاں کے لئے اجنبی کیسے ہو سکتے ہیں؟

شہزادہ محمد علی پاشا

محمد علی پاشا سابق وزیر اوقاف و زعیم جماعت احرار مصر نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

جنگ بلقان میں، جنگ عظیم میں، ترکوں اور یونانیوں کی لڑائی میں محمد علی نے جو کچھ کیا وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا اور اس غرض کے لئے جو کچھ اسے جیل خانوں اور مالی تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا وہ بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس کا شعور اس خیال سے اس پر حاوی تھا کہ:

"قوت حق نہیں لیکن حق قوت ہے"

اے معزز مسافر، یہ مصیبت بڑی ہے، تکلیف بھاری ہے، لیکن ہم صبر کے اجر سے برداشت کر لیں گے، میں اس لئے آیا ہوں کہ تم کو سلام کہوں، تم مرے نہیں بلکہ زندہ ہو۔

ہماری تسلی تمھارے بعد تمھارے کام ہیں جو ہمیشہ رہیں گے، تیرے جانے سے قبل تیرے اعمال آگے چلے گئے، انھوں نے جنّات کے دروازے تیرے لئے کھول دئے اور تیرے اقربا کے لئے بزرگی کو چھوڑ گئے۔

۲۰۳

احمد زکی پاشا

آپ نے مسجد اقصیٰ میں کھڑے ہو کر فرمایا۔

اے بزرگان مسجد اقصیٰ! اے ابنائے عرب! اور اے اُمتِ اسلام!

مولنا محمد علی کی زندگی جہاد کی ایک مسلسل لڑی تھی، زمانہ نے اُسے دیکھا اور تاریخ نے اُسے محفوظ کیا اور یہی نہیں بلکہ آج کے بعد لوگ ہمیشہ یہ دیکھیں گے کہ ہمیشہ کے لئے وہ قربانی کی انمٹ یادگار رہے گا وہ اس امر کا عنوان رہے گا کہ وہ شخصیت کا سخت دشمن تھا۔

ہم اس کے گواہ ہیں کہ شہید اپنے ہم عصروں میں لسان صدق تھا اور ہمارے دل اُس ایمان سے پر ہیں کہ خُدا نے اس پر انعام کیا اور اس کو آخر میں بھی لسان صدق بنایا۔

اس ہندوستانی لیڈر نے اپنی زندگی ملک کے لئے وقف کر دی تھی، اس نے اپنے ملک کی آزادی کے لئے وہ وہ جہاد کیا کہ جہاد کا حق ادا کر دیا۔

فقید علم اور خادم اسلام پر خدا کی سلامتی۔